

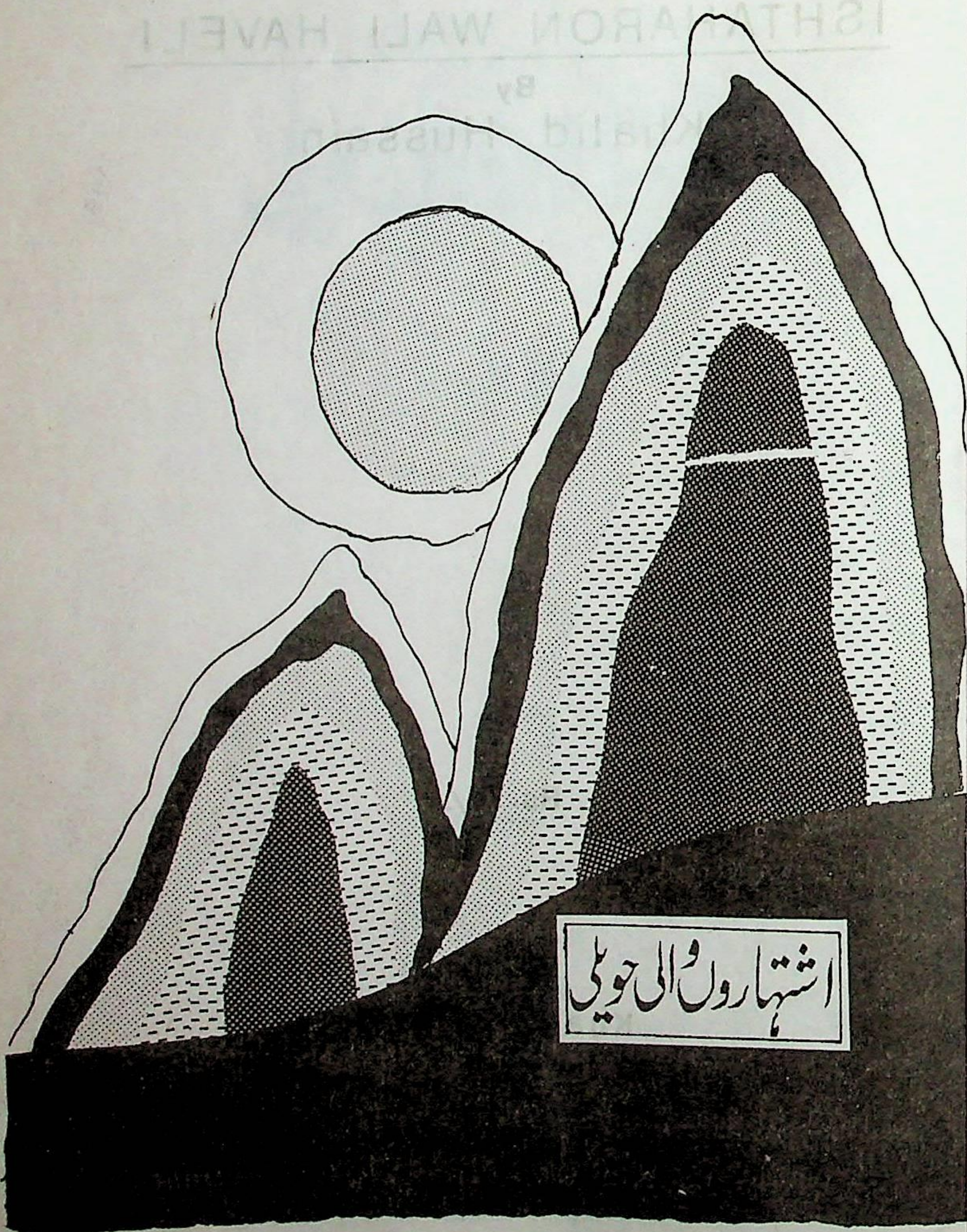
CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

Ishtiharoon
wali Haveli

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ISHTAHARON WALI HAVELI

By

Khalid Hussain

Rs. 75/-

Editor

Khalid Kifayat

Publisher

Imroz Kutab

ISMAT MANZIL, MALERKOTLA.

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اشتہاروں والی حویلی

خالد حسین

ترتیب و تزئین

خالد کفایت



امروز کتب۔ عصمت منزل۔ مالیرکوٹلہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

اس مجموعے میں شامل سبھی کہانیوں کے کردار، واقعات اور مقامات قطعی فرضی ہیں اور کسی بھی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے مصنف / مرتب پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی

طبع اول :- ۱۹۹۱ء

تعداد :- ایک ہزار

ناشر :- امروز کتب
عصمت منزل مالیر کوٹلہ

مطبع :-

قیمت : ۷۵ روپے

سرورق : خالد کفایت
خالد آرٹس مالیر کوٹلہ

خوش نویس :- محمد سلیم دیوبندی

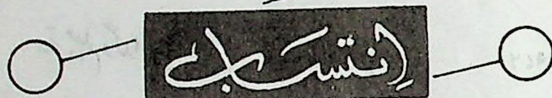
اهتمام

ذاکر پبلیکیشنز ۱۳۰ گوجر نگر، جموں توی
(جموں کشمیر)

تقسیم کار

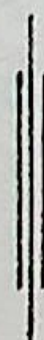
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



کھُلی ہواؤں، بہتے دریاؤں اور آزاد پرندوں کے نام

نہ سرِ راہ کوئی کوہِ سر بلند ہوا
نہ روک پائیں جنھیں سرحدوں کی دیواریں



جناب ایس ایس بلوریا

اور

برادرم اقبال کھانڈے

کی نذر

"سپردم بتو مایۂ خویش را"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اسی قلم سے

تے جہلم وگدا رہیا	پنجابی کہانیاں	۱۹۷۶
گوری فصل دے سوداگر	پنجابی کہانیاں	۱۹۸۱
ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں	اردو کہانیاں	۱۹۸۱
ڈونگھے پانیاں دا دکھ	پنجابی کہانیاں	۱۹۸۸

اسی ادارے سے

آشوبِ غم	از	خالد کفایت
پچھلے پہر	"	مشتاق وارثی
ملک الشعراء گرامی جالندھری	"	طارق کفایت
ڈوبتے منظر کا سفر	"	سلطان انجم

اور

پرچھانویں دی بھال	(زیر طبع)	خالد کفایت
آخر شب کے مسافر	(زیر طبع)	شعرائے مالیر کوٹلہ
انحراف	(زیر طبع)	مشتاق وارثی

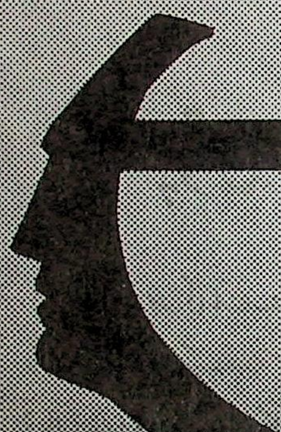
CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

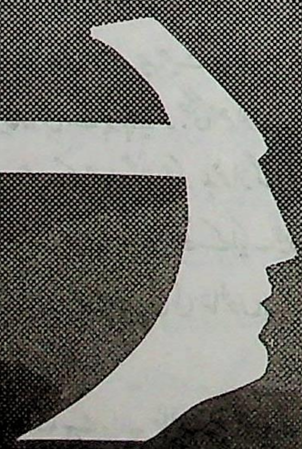
ترتیب

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گھر کی بات

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri





چہرہ پسِ چہرہ

باسمہ

چوتھی سمت کا شہزادہ — خالد حسین

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اے سی ڈی تھا، نہ بی ڈی او بلکہ سیدھے سبھاؤ ایک حال مست قسم کا کلرک تھا جو سکریٹریٹ میں فائلوں سے اور محلّے میں بیڈے سے الجھا رہتا۔۔ جی ہاں — وہی بیڈا جس کی لنکا بڑے بڑے حادثوں بھونچالوں اور طوفانوں کے باوجود بھی استاد محلّے میں شان سے کھڑی تھی۔ اس سے فرصت ملتی تو وہ ان حویلیوں کو تکنے لگتا جن کی دیواریں اشتہاروں کے بوجھ سے خمیدہ ہورہی تھیں مگر ان کے مکین آنے والے خطروں سے قطعی بے نیاز تھے۔ سکریٹریٹ میں اس کا کام سرکاری اخبار "دیہات سدھار" ایڈٹ کرنا تھا اسی میں چھپی تھی خالد حسین کی پہلی کہانی "گھر کی جنّت" —— سننے میں آیا ہے کہ حقیقت اور فسانے کے تانے بانے سے بنی گئی اس کہانی کی بنیاد کسی "معرکہ خیزی" پر تھی جس میں خالد نے عین آخری وقت ایک زوردار دھاوا بول کر مورچہ جیت لینے کے بجائے پسپائی اختیار کرلی تھی۔ کہانی کی شانِ نزول تو خود خالد ہی سے پوچھیئے کہ جنگی معرکوں کی داستانیں فوجی جرنیل مزے لے لے کر سنایا کرتے ہیں۔ البتہ اس کے "عذرِ گناہ" کو بدتر از گناہ گردانا گیا اور کئی روز تک گھر کی فضا گرد آلود رہی۔ تاہم مطلع صاف ہوا تو استاد محلّے کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بڑا فنکار ضرور جنم لے چکا تھا۔ اور اعتماد محبّت اور خود سپردگی کی شاخوں پر وفاداری بشرطِ استواری کے پھول کھل اٹھے تھے۔

غالباً یہ سنہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اب خالد نے لکھنا شروع کیا تو پیچھے مڑکر نہیں دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس جادونگری میں پیچھے مڑکر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔ خالد کی کہانیاں اس کی فطرت کی آئینہ دار ہیں۔ مہیب چٹانوں سے ٹکرانا اور انھیں چور چور کر دینا ہمیشہ سے اس کی ہابی (Hobby) رہا ہے وہ سر جو کسی بیڈے کے آگے جھکا ہے نہ کسی باس کے آگے خم ہوا ہے اور ہمیشہ کج کلاہوں کو خون تھوکنے پر مجبور کرتا رہا ہے، آج بھی سربلند ہے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حقیقت بیانی اس کے فن کا خاصہ ہے اور اس معاملے میں وہ کسی سمجھوتے کا قائل نہیں۔ اُسے نہ مال و دولتِ دنیا ڈگمگا سکتے ہیں نہ رشتہ و پیوند اس کے پیروں میں زنجیر ڈال سکتے ہیں۔ اِن بتانِ وہم و گمان کے آگے سجدہ ریزی سے وہ ہمیشہ منکر رہا ہے۔ وہ پامال راہوں کا مسافر نہیں بلکہ نئی نویلی راہ گذاروں کا شائق ہے۔ اسی لئے اس کی مثال داستانوں کے اس باغی و خودسر شہزادے کی سی ہے جس نے تین محفوظ سمتیں چھوڑ کر ہمیشہ اس چوتھی سمت کی جانب قدم بڑھائے ہیں جو خطرات سے پُر اور تحفظات سے عاری ہے۔

ضدیں تو شان ہوا کرتی ہیں رئیسوں کی ؎ جو چوتھی سمت نہ جائے وہ شاہزادہ کیا

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بیچ میں آٹپکا۔ بات ہو رہی تھی خالد حسین کی پہلی اردو کہانی کی جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے میں نے بھی اسی سال علیگڑھ میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس سے پورے دس سال بعد میں نے پہلی پنجابی غزل کہی جو امرتسر کے رسالے "ساہتکار" میں شائع ہوئی ـــــ اس دوران خالد حسین پنجابی ادب میں ایک منفرد اور معتبر نام بن چکا تھا اور کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ تنقید پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ اسی رسالے کے تنقیدی کالم ـــــ "پرکھ پڑچول" میں خالد حسین اور خالد کفایت کی پہلی ملاقات ہوئی جو بہت عرصے تک "آدھی" سے آگے نہ بڑھی۔ کاغذی ہاتھوں کے سلام آتے رہے اور ہم برابر ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش میں بھی مصروف رہے۔ اپنے اپنے حسابوں خوب خوب حملے کیے گئے۔ کبھی زبان و بیان کے مسئلے اٹھائے گئے تو کبھی اردو پنجابی کے جھگڑے نمٹائے گئے ـــــ تکلفات کی انہی پرچھائیوں تلے کافی سفر طے کر چکے تو استاد ذوقؔ کی یاد آئی جن کے بقول تکلف میں تکلیف سراسر تھی اور ہمیں ضرورت تھی آرام کی جو تکلف نہ کرنے والوں کو ہی میسر ہے۔ لہٰذا یکلخت دونوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ "آپ" "جناب" اور "صاحب" کے مورچوں سے باہر نکلے ـــ اور ـــ "تم" اور "تو" کی جنگ بندی لائن پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اپنائیت و یگانگت کی فضاؤں میں پہلی بار مجھے خالد کی وہ پر خلوص دعوت یاد آئی جو وہ بہت دنوں سے کشمیر کی سیر کے لیے دے رہا تھا اور جسے اس سے پہلے میں، محض تکلف سمجھ کر نظر انداز کرتا چلا آرہا تھا۔

ابھی کشمیر جانے کا پروگرام بن ہی رہا تھا کہ ایک روز وہ خود ہی مالیرکوٹلہ پہنچ گیا اور آن دھمکا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

عصمت منزل میں، ذاتی طور پر دعوت دینے کے لئے ـــــ اب تو کسی انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ راہِ فرار مسدود تھی ـــــ خالد سے اس پہلی ملاقات میں ہی، میں اس کے جذبۂ خلوص کی شدّت وحِدّت کا پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔

آئندہ چھٹیوں میں کشمیر جانے کے لیے پروگرام فائنل ہوگیا۔ مشتاق وارثی ساتھ جانے کے لئے تیار تھا ـــــ جی ہاں مشتاق وارثی ـــــ "پچھلے پہر" کا تخلیق کار ـــــ بڑی عجیب شے ہے۔ سگریٹ اور ساتھی میسر ہوں تو اسے قطب شمالی تک جانے میں بھی تکلف نہیں لیکن اکیلے میں وارث لاج سے حبیب کلینک تک کا فاصلہ طے نہیں ہوتا جو بمشکل بیس قدم ہوگا۔ جموں داخل ہوتے ہی اس کی سگریٹ نوشی خالد حسین کے حساب میں ہونے لگتی ہے کہ پرانے حاکم یوں ہی خراج وصول کیا کرتے تھے ـــــ بہرحال مشتاق تو کسی وجہ سے ساتھ نہ جا سکا۔ پر اکسی (Proxy) کے طور پر عارف میرے ہمراہ تھا اور ہماری منزل تھی تلسی باغ سری نگر کا وہ سرکاری کوارٹر جہاں خالد اور نسیم فردوس کے شاداں وفرحاں چہرے ہمارے منتظر تھے اور کوارٹر پہلے سے ہی ہمارے لیے ریزرو کر دیا گیا تھا۔

مہمان نوازی خالد فیملی پر ختم ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جموں کا چکر لگے اور اس کے گھر پر کسی نئے ادیب یا شاعر سے ملاقات نہ ہو۔ اسی لئے تو میں نے "الفردوس" کا نام "ادبی دھرم شالہ" رکھ چھوڑا ہے اور اس کا کریڈٹ خالد سے کہیں زیادہ نسیم فردوس کو جاتا ہے جس نے بارہا اپنے زیورات تک کی قربانی دے کر مہمان نوازی کی لاج رکھی ہے۔ عبدالعزیز سے عارف حلیم تک اور طارق کفایت سے انوار صدّیقی تک سبھی اس بات کی تائید کریں گے کہ خالد وہی مردِ مومن ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؔ فرما گئے ہیں ـــــ "مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا"۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادیب شاعر وغیرہ عملی زندگی میں بیکار محض (Good for nothing) ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خالد کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ جموں کشمیر میں آل انڈیا پنجابی کانفرنس کا انعقاد اس کی انتھک محنت اور بے پایاں لگن کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ ادبی مجالس اور خالد حسین لازم وملزوم ہیں اور وہ جہاں بھی گیا ہے، ادبی خوشبو بکھیرتا گیا ہے۔ جموں کشمیر کا ایک دور افتادہ مقام ہے ڈوڈہ۔ خالد کی کوشش سے وہاں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھی چار آل انڈیا مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے ان چاروں میں شرکت کا موقع ملا ہے اور جہاں دوسرے بہت سے مخلص دوستوں اور ڈوڈہ نواسیوں کی محبت کا تحفہ ملا ہے وہیں محترم اقبال کھانڈے (ڈپٹی کمشنر) برادرم اسحاق زرگر (سکریٹری بزم ادب) اور پیارے پیارے ظفر احمد (اسسٹنٹ ڈائریکٹر دوردرشن) کی علم دوستی، ادب نوازی اور ادیب پروری کی دولت بھی نصیب ہوئی ہے ــــــ یہ تیسرے مشاعرے کا ذکر ہے جب مشتاق وارثی اور رمضان سعید بھی ہمراہ تھے۔ سعید ان دنوں قرآن پاک کے پنجابی ترجمے میں مصروف تھا۔ چلتے چلتے چند اجزار ترجمے کے بھی لے لیے کہ خالد کے ساتھ مل بیٹھ کر اس کی زبان کے بارے میں گفتگو کی جا سکے۔ مشاعرے سے اگلے روز دو تین بھرپور نشستیں جمیں اور سورۂ یوسف کا ترجمہ زیر بحث آیا۔ خالد کی زبان دانی کے تو ہم لوگ پہلے سے ہی قائل تھے لیکن اس روز اس کے دینی شغف اور اسلامی شعائر کی جزرسی کے بھی قائل ہو گئے۔ یقیناً "ترقی پسند" خالد حسین کا یہ ایک نیا چہرہ تھا جو اس روز ہمارے سامنے آیا، حیران کن اور مسرت خیز۔

خالد کہانی لکھنا ہی نہیں جانتا، کہانی سنانے کے فن پر بھی مکمل دسترس رکھتا ہے۔ مالیرکوٹلہ کی محفلیں اس کی گواہ ہیں جہاں اس نے جوان راتوں کو ڈھل ڈھل کر صبحِ کاذب میں تبدیل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ کم بخت کہانی یوں سناتا ہے جیسے شاعر مشاعرے میں غزل ارشاد کرتا ہے۔ ناصر۔ یاسین بیگ اور برج نندن ان محفلوں کے گواہ ہیں جب واہ واہ، مرحبا، بہت خوب، مکرر کی صداؤں سے گونجتی ہوئی مجلسوں کو اس نے تاتاری حملہ آوروں کی طرح لوٹا ہے۔ صرف ایک محفل میں پوری اُنیس[۱۹] کہانیاں خالد نے مالیرکوٹلے میں ہی سنائی ہیں۔ اگر مالیرکوٹلے کو خالد حسین جیسا سنانے والا نہیں ملا تو اسے بھی کہاں مالیرکوٹلے جیسے باذوق سامعین نصیب ہوئے ہونگے جنھوں نے بنا پہلو بدلے اسے لگاتار کئی کئی گھنٹے تک سنا ہے اور بڑے بڑے وسیع ہال تنگ دامانی کے شاکی بنا دیے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر مرد کی ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ کسی اور کے بارے میں تو کہا نہیں جا سکتا لیکن خالد حسین کے بارے میں یہ قول حرف بہ حرف صحیح ہو سکتا ہے اگر اس میں عورت کے بجائے "عورتوں" استعمال کیا جائے۔ بھلے ہی وہ اس سے اتفاق نہ کرے لیکن

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

یہ حقیقت ہے کہ ازدواجی زندگی میں نسیم فردوس اس کے لئے سچ مچ "جنت کی ہوا" ثابت ہوئی ہے اس نے خالد کی شخصیت کو ہی نہیں ابھارا، فن کو نکھارنے میں بھی مدد دی ہے۔ خود خالد نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے چاہے دبے لفظوں میں سہی —— دوسرے بہت سے دوستوں کے ساتھ ساتھ تنویر جہاں اور ڈاکٹر کیرتی کیسر نے بھی اس کا ادبی قد بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اور اس پر مستزاد خالد کی مشہور و معروف کہانیاں جن میں صنفِ نازک پوری توانائی و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عورت کی معاشرتی مشکلات اور نفسیاتی الجھنوں کے بیان میں وہ منٹو سے بھی دو ہاتھ آگے دکھائی دیتا ہے۔ کہانیوں پر تنقید اس خاکے کا موضوع نہیں ہے ورنہ میں مثالیں دے کر واضح کرتا کہ نسوانی کرداروں کی پیش کاری اور کردار نگاری سے خالد حسین نے کس طرح اپنے فن کی زیبائش و آرائش کا کام لیا ہے نسوانی مسائل کو جتنی اچھی طرح وہ سمجھتا ہے وہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اسے اونچے پربتوں کی اداسی کا راز بھی معلوم ہے اور گہرے پانیوں کے دکھ کا بھی اندازہ ہے اور وہ اپنے قاری تک ان کی ترسیل کے فن سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔

دوست بنانے کا فن اسے خوب آتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ دوستی نباہنے کے لئے وہ آخری حد تک جانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ کی اس کے نزدیک کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اپنی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ اسے انہی لوگوں سے ملے ہیں جنھیں "سڑک چھاپ" کہا جاتا ہے۔ اس کا ہر ایک دوست یہی سمجھتا ہے کہ وہی خالد کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اور اس کا یہی کمال ہے کہ وہ کسی کو بھی اس خوش فہمی کے جال سے نکلنے نہیں دیتا —— خواہ خود اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے وہ دوستی کے نازک آبگینے کو ٹھیس نہیں لگنے دیتا —— خیالِ خاطرِ احباب کے لیے سینکڑوں بار نقصان اٹھانے کے باوجود بھی اس نے اپنی روش نہیں بدلی اور لگتا ہے کہ بدلے گا بھی نہیں —— یوں تو پنجاب بھر میں، بلکہ ہندوستان بھر میں اس کے دوست احباب بکھرے ہوئے ہیں مگر مالیر کوٹلہ سے اس کو دوگونہ تعلق ہے۔ یہاں اس کے دوست بھی ہیں اور اس کے عزیز بھی —— اور کسی حد تک اس کی وہ گمشدہ جنت بھی یہاں موجود ہے۔ جو تقسیم وطن کے ہنگاموں میں ادھم پور میں اس سے چھن گئی تھی —— یہاں اس کا خاندان بھی ہے۔ اس کے بھائی بہن، عزیز و اقارب، سگے سمبندھی سب موجود ہیں جن کی محبت بہت عرصہ تک

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیۓ خواب وخیال ہی بنی رہی ہے ــــ اسی لئے تو خالد حسین کا دوسرا گھر بالیر کوٹلے میں ہے۔

خالد کی شخصیت مختلف ومتضاد کیفیات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔ کبھی وہ انتہائی نرم دل ہے تو کبھی حد سے زیادہ سخت گیر۔ ٹوٹنے کی اسے پروا نہیں لیکن جھکنا اس کے لئے ناممکن ہے ــــ کبھی وہ حد سے زیادہ روشن خیال اور ترقی پسند دکھائی دیتا ہے تو کبھی "بنیاد پرست" بن کر مسجدوں کے لیے چندہ جمع کرتا پھرتا ہے۔ دراصل جو بات اسے صحیح محسوس ہو اس پر کوئی سمجھوتہ کرلینا اس کی شریعت میں کفر ہے۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی پردہ پوشی کرنا وہ گناہ سمجھتا ہے اور موقع بے موقع بھی ان کا ڈھنڈورہ پیٹنے سے باز نہیں آتا۔ خامیوں کی بات چلی تو کہنا پڑے گا کہ وہ بھی انسان ہے فرشتہ نہیں ــــ اور بشری کمزوریوں سے اس کا دامن بھی آلودہ ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ وہ انھیں چھپانے کے بجائے ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

جیسے کہ پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے کے فن میں اسے معراج حاصل ہے۔ اس میں جہاں اس کی مقناطیسی شخصیت کا دخل ہے وہیں جذبۂ ایثار و خلوص کی کارفرمائی بھی ہے۔ کاروبارِ دوستی میں وہ سود وزیاں کی پروا نہیں کرتا ــــ بلکہ "حسابِ دوستاں در دل" کا قائل ہے۔ اسی لیے اس کے حلقۂ یاراں میں ادیب و شاعر ہی نہیں افسران وسیاست داں بھی شامل ہیں ــــ اپنے ماتحتوں سے بھی اس کا سلوک دوستانہ ومربیانہ ہے، نہ کہ افسرانہ ــــ یہ روش بارہا اس کے لیے نقصان کا باعث بھی ہوئی ہے۔ اور بہتیروں نے اسے بنامِ دوستی زک بھی پہنچائی ہے۔ مگر پھر بھی کبھی اس کے لب پر حرفِ شکوہ نہیں آیا اور نہ ہی وہ اس "چوتھی سمت" سے مراجعت پر مائل ہے جسے اس نے رہ گذارِ حیات قرار دے رکھا ہے ــــ بڑی سے بڑی مشکل میں بھی میں نے کبھی اسے جی ہارتے نہیں دیکھا۔ بلکہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہی پایا ہے۔ یہی ہنسی بے تکلّف یاروں کی محفل میں فلک شگاف قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور ایک ہاتھ داد لینے کی کوشش میں مسلسل کسی نہ کسی مقابل پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ حملہ آور ہی نہیں ہوتا بلکہ شدّتِ خلوص سے جکڑ بھی لیتا ہے۔ یہ ادا اس وقت تو اور بھی پیاری لگتی ہے (خالد حسین کو زیادہ، مقابل کو کم) جب مقابل ہاتھ نرم بھی ہو اور گداز بھی ــــ کیونکہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

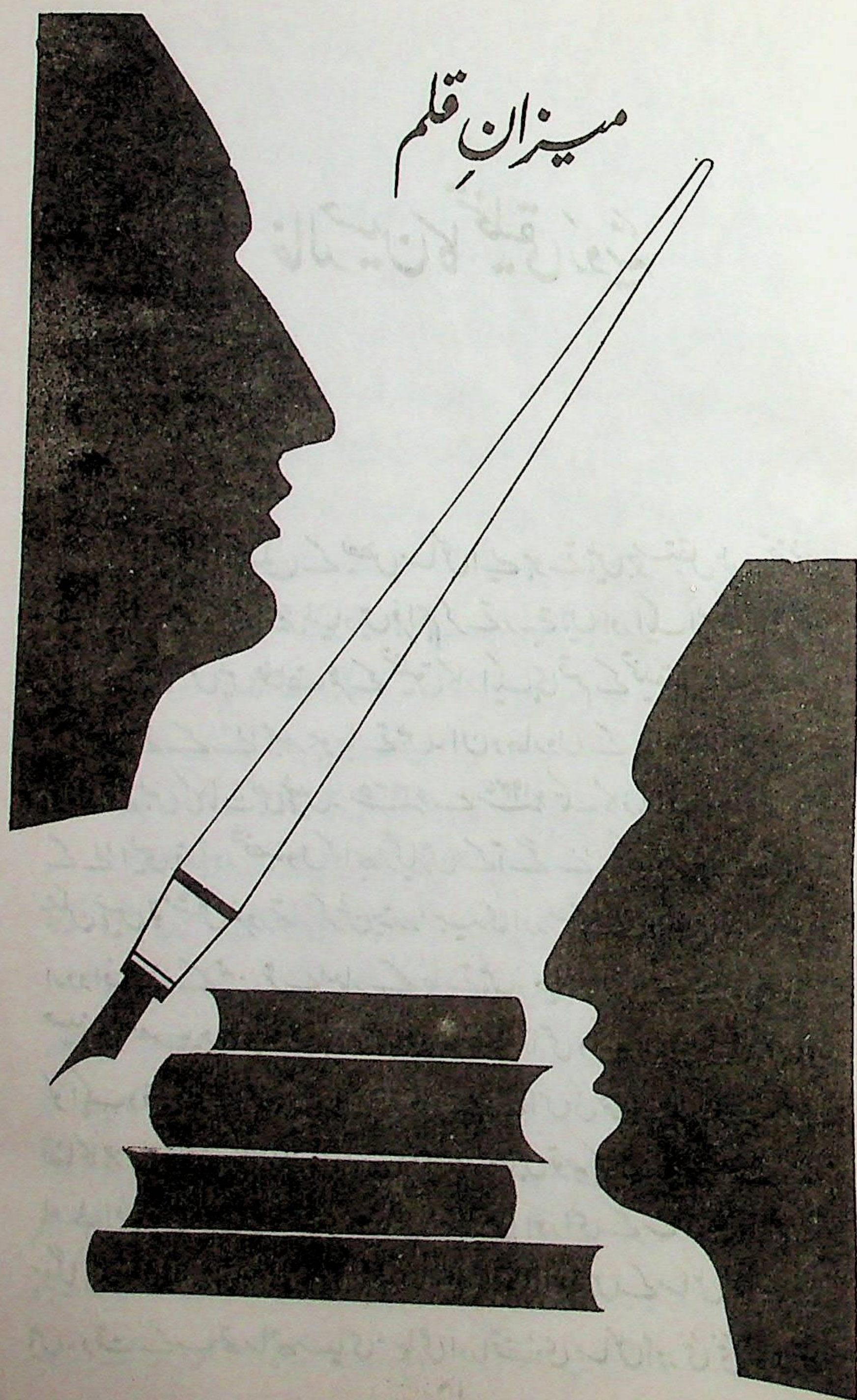
بے تکلف دوستوں کی فہرست بناتے وقت اس نے کبھی تذکیر و تانیث کی تخصیص روا نہیں رکھی ہے ـــــــ خلوص و محبت کا یہ جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے تو خالد کی زبان پر انتہائے یگانگت میں ایسے الفاظ بھی مچلنے لگتے ہیں جنہیں "بد ذوق" حضرات "غیر پارلیمنٹری" کہہ کر محفل بدر کر دیا کرتے ہیں۔ پنجابی زبان کا مشہور عام فقرہ "یاراں نال بہاراں، دنیا لکھ وسدی" شاید ایسے ہی یاروں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

خالد کے دوستوں کی فہرست طویل سہی، اس کے دشمنوں کی فہرست طویل تر ہے کہ دنیا حاسدوں سے کبھی خالی نہیں رہی جن کی آنکھوں میں اس کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ کسی کو اس کی مقبولیت سے بَیر ہے تو کسی کو اس کی ترقی سے کَد ہے۔ حاسدوں اور دشمنوں کی ایک بڑی تعداد ہمہ وقت اسے زک پہنچانے کے درپے رہتی ہے لیکن خالد انھیں نگاہِ غلط انداز کا سزاوار بھی نہیں سمجھتا۔ درگذر کرنا اور کرتے ہی چلے جانا اس کی عادت ہے ـــــ مگر اپنی ہی دُھن میں مست فیلِ بے پروا، سگانِ راہ کو کچل دینا بھی جانتا ہے کہ اپنے وجود کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کبھی یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ دوستوں کے لئے دستہ گل ہے تو دشمنوں کے لیے شمشیر برہنہ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے "خالد"

خالد کفایت
عصمت منزل۔ مالیر کوٹلہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد حسین کا تخلیقی رویہّ

زندگی کے بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو مستقل طور پر ختم نہیں ہوتے بلکہ تخلیق کے لئے بنیادیں فراہم کرتے رہتے ہیں اور ایک ایسی فضا تشکیل کر دیتے ہیں جس میں مختلف عمر کے تخلیق کار ایک ہی قسم کے تخلیقی دباؤ اور تشنج میں مبتلا ہونے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان دھاروں کے بہاؤ کو روکنا ایک سچے فنکار کے بس کی بات بھی نہیں۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ اردو کہانی کی تخلیق کے لئے ایسی قدآور شخصیتوں کو ابھار گیا جن کے آگے نئے لکھنے والوں کے قد کا بڑھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کرشن چندر، بیدی اور منٹو، پریم چند کے بعد جدید اردو افسانے کے تین بڑے معمار سمجھے جاتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، احمدندیم قاسمی وغیرہ نے بھی اردو کہانی کو ایک وقار دیا اور زندگی سے قریب ترین کر کے اس کی حرارت اور روشنی کو تخلیقی فضا کا جزو لاینفک بنا دیا۔ اسی دور میں اس قدر قابل توجہ کہانیاں لکھی گئیں کہ جنکے باعث افسانوی ادب میں ایک گراں مایہ اضافہ ہوا اور اسی کے ساتھ وہ دور بھی ختم ہو گیا ـــ لیکن ـــ انسان کبھی ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے مسائل ختم ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل اور نئی نئی تحقیقات

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کے نتائج واثرات پل پل اندھیرے پل پل اجالے کے مصداق عدم و وجود کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ تخلیقی فضا کا تشدد فن کار کے ذہن وادراک پر وہ اثرات مرتسم کرتا ہے کہ فنکار چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اپنے ماحول، سماج اور عصری مسائل سے دور نہیں رکھ سکتا۔ انسانی زندگی کے مسائل کا حل شاید اس کے پاس نہ ہو لیکن عصری مسائل کی نشاندہی وہ کر ہی دیتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد آنے والی نئی نسل کے ایسے ہی کہانی کاروں میں خالد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کا ذہنی رشتہ ان ادیبوں سے بھی ہے جو آزادی سے پہلے لکھتے رہے اور ان فن کاروں سے بھی ہے جنھوں نے آزادی کے بعد اپنی محنت اور تلاش و جستجو سے نئے راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ وقت اور فاصلوں کے باوجود بنیادی سچائیوں اور مشترک قدروں کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے انداز نظر اور زاویۂ نگاہ بھی ایک ہو لیکن مختلف فاصلوں کے باعث کہانی کے کرداروں کے خد و خال اور ان کے چہروں کی شناخت میں یقیناً امتیاز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال خالد کے یہاں بھی ہے حقیقت کا احساس ان کے تخیل کے روبرو نصب العین کے طور پر ملتا ہے جس کے باعث وہ سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں لیکن ان کے کردار یقیناً کہانی کے گذشتہ کرداروں سے مختلف ہیں۔ ان کرداروں کی جرأت ان کی صلاحیت اور ان کی محبت اور نفرت، ان کا اعتماد ان کا زمانہ، ان کا ماحول انھیں ماضی کے کرداروں سے الگ کر دیتا ہے اور وہ اپنی ایک نئی شناخت لے کر کہانی کے منظر نامہ میں ابھر آتے ہیں اس لئے بھی کہ خالد انسانی زندگی کی فتح و شکست، جبر و اختیار اور زبردست و زیردست کو ناپنے کے لئے نیا پیمانہ بناتے ہیں جن میں محض انفرادیت کا احساس نہیں، اجتماعیت کا شعور ہے۔ سماج اور معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کی نقاب کشائی ہے لیکن اس عمل میں خالد کا بنیادی رویّہ ظالم اور مظلوم کو انسانی نقطہ نظر سے پرکھنے کا ہے اسی لئے ان کے کردار مثالی کردار نہیں بلکہ ہماری جیتی جاگتی زندگی میں سانس لیتے ہوئے زمینی کردار ہیں جن کی نیتوں سے افسانہ نگار بخوبی واقف ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد کے کردار اپنے ہاتھوں کی لکیریں لے کر خود پیدا ہوتے ہیں افسانہ نگار محض ان کا تعارف کراتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی قوت اور نمو کے مظاہرے کے لئے بھی اپنے کرداروں کا سہارا نہیں لیتا بلکہ فطرت کے جلالی عنصر کے پس پردہ اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ خالد کو مثالی کردار پیش کرنے کے بجائے حقیقت پسندی زیادہ عزیز ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ان کرداروں میں اپنے دل کی دھڑکنیں اور اپنی زندگی کی جھلک دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وابستگی کا یہی احساس اور قربت کی یہی آنچ خالد کی کہانیوں کا بنیادی وصف ہے۔

اہم بات یہ نہیں کہ ادب تخلیق کیا جائے دیکھنا یہ ہے کہ ادب کو جہت اور بنیاد فراہم کرنے میں کوئی فنکار کہاں تک کامیاب ہوا ہے، اس نقطۂ نظر سے جب ہم خالد کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انکی تخلیقات بے سمتی اور بے جہتی کا شکار نہیں بلکہ روایت ادب کو فکر و اظہار کی سطح پر آگے بڑھانے کا دوسرا نام ہے جن کی بدولت قارئین کے اذہان نئے شعور سے آشنا ہو کر، احساس و ادراک کے نئے معیار تلاش کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ خالد کی تخلیقات کا تعلق اپنے معاشرے کی روح سے پوری طرح وابستہ ہے اور انسانی و سماجی مسائل ان کے ذہن پر پوری گرفت رکھتے ہیں۔ یہ مسائل محض تخلیق کا موضوع ہی نہیں بلکہ افسانہ نگار نے انھیں شعوری طور پر قبول بھی کیا ہے۔ اسی لئے ان کے تخلیقی ذہن میں وہ اعتماد ہے جو تخلیق کے لئے ازبس ضروری ہے۔ حقیقت کا احساس یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالد کے تخیل کے روبرو نصب العین کے طور پر ملتا ہے۔ اس لئے وہ حقیقت کو پیش کرنے کے لئے صرف اس کا سطحی مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ اسے بہت قریب سے دیکھتے ہیں، اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ معاشرے کے اندر افراد کے تعلقات کا تعین زندگی کی کش مکش سے نہیں کرتے، شاید اسی لئے انھیں معاشرے کے بدکردار افراد سے ہمدردی نہیں۔ وہ ماحول کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے ان افراد ہی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو اس ماحول کے پروردہ ہیں۔ وہ سماجی مسائل کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے بجائے ان مسائل کے روز افزوں قد و قامت پر انگلی اٹھاتے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہیں لیکن خیر و شر کی کش مکش دکھانی مقصود ہوتی ہے تو وہاں خیر کی غالبیت اور شر کی مغلوبیت خود ان کی نیک نیتی پر دال ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خالد کے موضوعات میں سماجی شعور اور انسانی رشتوں کی اتنی سمتیں ہیں جو نہ صرف ہم عصر تقاضوں کو پورا کرتی ہیں بلکہ ان کی تشکیل نو کر کے زندگی کو آگے بڑھانے میں بھی اہم رول ادا کرتی ہیں۔

خالد نے زندگی کے بعض مسائل کو اس طرح چھیڑا ہے کہ وہ مسائل نہیں رہتے بلکہ خود زندگی بن جاتے ہیں اس لئے بھی کہ زندگی کو بیک وقت اس کی ساری بیماریوں، تعفن، منفی اور مثبت پہلوؤں کے ساتھ قبول کرنے سے فن کار وہ تجربات حاصل کرتا ہے جو تجربے کی راہ سے گذر کر تخلیق بن جاتے ہیں۔ خالد اپنے دور کے ان پیچ در پیچ تجربوں کو سمیٹ رہے ہیں جن سے اسلاف افسانہ نگاروں کو بھی واسطہ پڑا تھا اس لئے فکر کی سطح پر خالد کی کہانیوں کا اپنی روایت سے گہرا تخلیقی رشتہ ہے البتہ اظہار کی سطح پر وہ جدید فنکاروں سے زیادہ قریب ہیں۔

خالد حسین کی ایک کہانی "دیواروں میں چھپی واسنا" میں ایک کردار یہ کلمہ ادا کرتا ہے "وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو اس کے اندر بھی آگ جلتی ہے" —— اگرچہ اپنی کہانی کے رشتہ سے ایک مخصوص معنویت کا حامل ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ ڈائیلاگ خالد کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جتنے مثبت کردار آتے ہیں تقریباً سبھی اس خصوصیت کے حامل ہیں۔ زمانے کے تلخ تجربات کے باعث ان کی زبانوں میں نشتر اور زہر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک معمولی سا جملہ کہہ جاتے ہیں لیکن اس میں غضب کا طنز پوشیدہ ہوتا ہے اگر آپ خالد کی کسی کہانی کی چھت پر برف پڑتی دیکھ رہے ہوں تو سمجھ لیجئے اس کے اندر ضرور آگ جل رہی ہوگی۔ یہ آگ ہمہ وقت نہیں جلتی بلکہ موسم اور ماحول کے ردعمل کے طور پر جلتی ہے۔

ادیب سماج سے متاثر ہوتا ہے اور سماج ادب سے لیکن ادب کے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ اچانک وہ سماج کو بدل ڈالے۔ خالد حسین کی کہانی "اشتہاروں والی حویلی" کچھ اور نہیں بلکہ ہماری تہذیب اور ہماری زوال پذیر معاشرت کی ایک علامتی کہانی ہے جس کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

افراد اپنے گھناؤنے اعمال سے اسے خستہ و بدحال کئے جارہے ہیں اور انتہا تو یہ ہے کہ اس حویلی کے انہدام کے باوجود ان افراد کے سر شرم سے نیچے نہیں ہوتے بلکہ وہ اسی اندازِ تفخر اور ڈھٹائی کے ساتھ سر اٹھائے چلتے ہیں۔ لیکن وہ افراد جنہیں اپنی سنہری اقدار اور صالح روایات سے عقیدت و محبت ہے اور جو سماج سے رشتہ وابستہ کر کے ایک اجتماعی پیار و محبت کو فروغ دینا چاہتے ہیں انھیں سماج کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اشتہاروں والی حویلی کا گونگا کردار دراصل گونگا نہیں بلکہ وہ افسانہ نگار ہے جو اپنی زبان کا استعمال نہیں کرتا لیکن اس کی قوت مشاہدہ اس قدر تیز ہے کہ وہ بیک نظر تمام اشیاء کو اپنے حیطۂ بصارت میں لے لیتی ہے اور پھر افسانہ نگار اپنی نوکِ قلم کی طاقت سے ان سب کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور دلکش اسلوب کا حامل ہے۔

خالد حسین کے یہاں عورت مختلف رنگوں اور مختلف کرداروں کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اگر ایک مقام پر مظلوم ہے تو دوسری جگہ انتقام لینا بھی جانتی ہے۔ خالد کی کنوار گندل ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جو بیوگی کی زندگی گذار رہی ہے لیکن جب وہ اپنے جیٹھ کی ہوس کا شکار ہوتی ہے تو انتقاماً اس کے داماد کو اپنا شکار بناتی ہے۔ نتیجتہً داماد پوری طرح "گلاں" کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔

وہ ترقی پسند ادیب جنھوں نے اپنی زندگیاں ایک نئے انقلاب کے لئے برباد کر دیں اپنی پوری توانائی سے ادب تخلیق کیا لیکن ان کی قسمت میں کیا آیا، وہی مفلسی، وہی عزت اور بے چارگی۔ چاہے وہ منٹو ہو یا پرویز ہاشمی، انجام سبھی کا ایک ہے۔ خالد کی کہانی "سورج کا گیت" اسی انجام پر روشنی ڈالتی ہے۔

"وکھو کھلا سورج" میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ افسانہ نگار کے طنزیہ اسلوب سے قاری پر خود بخود یہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ اور وہی ہوتا ہے جو قاری کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا ——— لیکن ——— اس کہانی کا آخری ٹکڑا رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ جب مریم (جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا) کے آسیب زدہ جسم کی پسلی سے ایک ننھے سائے کا جنم ہوتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پھیل کر قد آور عورت میں ڈھل جاتا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہے۔ اور پھر اس کی زبانی صاحبِ افسانہ نے کمال انداز سے حضرت فاروق اعظم رضؓ کا وہ واقعہ دوہرایا ہے جب آپ نے اپنے صاحبزادے کو جرم زنا کے ارتکاب پر سو کوڑوں کی سزا سنائی تھی۔ مجرم ابھی ساٹھ کوڑے بھی نہ کھا پایا تھا کہ مر گیا لیکن باقی کوڑے بحکم فاروق اعظم رضؓ مجرم کی قبر پر لگائے گئے تھے۔ اس اعتبار سے خالد اپنے معاشرے سے خائف ہیں لیکن اس کے پیچھے دوڑنا بھی چاہتے ہیں۔ ان کی فنی بصیرت ہم عصر فکر و احساس کے تمام سانچوں کو حسین بنانے کی کوشش کرتی ہے چاہے وہ بظاہر ہمارے سامنے مکروہ صورتوں ہی میں کیوں نہ آئیں۔

"گوری فصل کے سوداگر" میں برگد کا پیڑ، اندھی رات اور کم سن شجر ایسی علامتیں ہیں جن تک کہانی کے تناظر میں قاری کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی علامتی کہانی ہے جو اشکال معانی کے باعث ترسیل و ابلاغ میں ناکام نظر آتی ہے

اس میں شک نہیں کہ خالد کی کہانیوں میں افسانویت ان کے اسلوب کی رہینِ منت ہے۔ رمز نگاری کا پیرایۂ بیان انھیں بہت مرغوب ہے اور وہ استعاراتی طرزِ بیان اختیار کر کے قارئین اور ناقدین سے اپنی علیحدہ حیثیت منوا لیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اسلوب کی تشکیل میں استعارات و علامات کی بہتات معنیٰ کی اس قدر تہیں پیدا کر دیتی ہیں کہ اصل مفہوم تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے لیکن یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ ان کی بعض کہانیوں کا لطف سادگیٔ بیان و پرکاری اور طنز کے اچھوتے پن میں مضمر ہے۔ بعض مقامات پر فقروں کے چٹخارے اور معنویت کی لذتیت قاری کو منٹو کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے فنی وسائل میں نغمگی اور غنائیت کے ساتھ کھردرے پن کا احساس بھی ہوتا ہے جو موضوع کی مناسبت سے بے جا بھی نہیں۔ خالد کی کہانیوں کا یہ نمایاں وصف ہے کہ ان میں محض جذباتیت، قصہ گوئی یا تجریدی بیانات ہی نہیں حسنِ بیان بھی ہے اور لذتِ معنیٰ بھی، جمالیات بھی ہے اور مقصدیت بھی۔ ادب اور زندگی کا ایک حسین امتزاج خالد کے افسانوں کی اہم خصوصیت ہے۔

خالد حسین کو اپنی اہمیت منوانے کے لئے کافی محنت کی ضرورت ہے اس لئے بھی کہ انھوں نے جس تخلیقی کرب کو اپنا مقصد بنایا ہے اس کی شہرت عارضی نہیں بلکہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بامقصد اور صالح ادب کی دنیا میں ایسے دیرپا نقوش ثبت کرنے کی راہ اختیار کی ہے جن کی بدولت ان کا نام افسانوی ادب میں زندہ رہ سکے گا۔ اس لئے بھی کہ خالد اسی فضا اور تخلیقی سیلاب میں سانس لے رہے ہیں جس میں کرشن چندر، بیدی اور منٹو جیسے ادیب سانس لیتے تھے۔ اسی لئے وہ ان افسانہ نگاروں سے مختلف بھی نہیں، لیکن خالد حسین کے یہاں بعض رویے ایسے ضرور ہیں جنھیں محسوس کر کے ان کی انفرادیت یا ان کے تشخص کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

ایم اے (فارسی)، پی ایچ ڈی

ایم اے (اردو) پی ایچ ڈی

--- ریڈر

نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

مالیر کوٹلہ

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔ پنجاب

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد حسین کی افسانہ نگاری

جموں کشمیر ایک کثیر اللسانی ریاست ہے۔ یہاں کے ادیب اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح سے جن ادیبوں نے اپنی ایک شناخت اور انفرادیت قائم کی ہے ان میں خالد حسین کا نام سرِفہرست ہے۔ یہ پنجابی کے ادیب ہیں مگر اردو میں بھی ان کا ایک اہم مقام ہے۔ انھوں نے پنجابی افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور منفرد طرزِ تحریر، اسلوبِ بیان محاورات و روزمرہ کے برمحل استعمال اور جزئیات نگاری کی بدولت اپنی ایک الگ پہچان قائم کی۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو کی جانب بھی توجہ دی اور اپنی بیشتر کہانیوں کے اردو تراجم کئے اور بہت سی کہانیاں براہِ راست اردو میں بھی لکھیں۔

بحیثیت مجموعی اردو کے افسانوی ادب میں تو ان کا شمار ہے ہی لیکن اپنے مخصوص طرزِ تحریر اور دل کش اسلوبِ بیان کی وجہ سے پنجابی ادب میں ایک معتبر اور ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں انھوں نے شاہ مکھی میں اپنا پہلا پنجابی افسانوی مجموعہ "تے جہلم وگدا رہیا" پیش کیا۔ جس کی ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی۔ یہ مجموعہ کل چھبیس ۲۶ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کی کہانیوں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کے دو اور مجموعے گورمکھی رسم الخط میں "گوری فصل کے سوداگر" اور "ڈونگھے پانیاں دا دکھ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی بہت سی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کر کے اور کچھ نئے افسانے لکھ کر سنہ ۱۹۸۱ء میں "ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں" منظرِ عام پر لائے اس میں ان کی کل تینتیس ۳۳ کہانیاں شامل ہیں۔ جن میں سے ۱۴ "تے جہلم وگدا رہیا" سے لی گئی ہیں۔ بقیہ ۱۹ نئی تخلیقات ہیں جن میں کچھ اس سے قبل "گفتگو" "شمع" "شب خون" اور "شیرازہ" جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں "کھوکھلا سورج" "گھاس پر چلنا منع ہے" اور "گوری فصل کے سوداگر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خالد حسین افسانہ نگاروں کی اس پود سے تعلق رکھتے ہیں جس نے روایت اور ماضی کے مشاہدات و تصورات سے ہٹ کر جب حال کی زندگی کو اپنانا چاہا تو اپنے گرد و پیش تقسیم کے خونیں واقعات و سانحات کے سوا کوئی بات کہنے والی نظر نہ آئی۔ انھیں اپنے ارد گرد منتشر اور مضطرب زندگی دکھائی دی اور جب افسانہ نگاروں نے ان واقعات و حادثات کی عکاسی کی تو بیشتر موضوع سے بہک گئے اور فن سے انصاف نہ کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود افسانہ نگاروں کا ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جس نے افسانوی روایات کا پوری طرح احترام کیا اور اسے بدستور قائم رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے بعد رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات نے افسانے کی فنّی روایت کے تسلسل کو درہم برہم کر دیا تھا اور ان تمام فنکاروں کو دم بخود کر دیا تھا جنھوں نے سالہا سال سے انسانی قدروں کی آبیاری کی تھی۔ حالات آہستہ آہستہ مستحکم ہوئے اور فنکاروں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو انھیں ہر شے میں ایک تبدیلی اور نئے پن کا احساس ہوا چنانچہ انھوں نے انہی مناظر کی تصویر کشی اور حالات و واقعات کے دلچسپ مرقعے پیش کیے۔

خالد حسین نے ۱۹۷۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ جب تقسیم ملک سے پیدا شدہ انتشار و اضطراب سے ابھی ادیب سنبھل رہے تھے اور ادب اس حد تک جمود و تعطل کا شکار ہو گیا تھا کہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ فنکار پھر اس ڈگر کو پا سکیں گے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جہاں وہ تقسیم سے پہلے تھے۔ لیکن حالات نے آہستہ آہستہ کروٹ بدلی اور ادیب ایک بار پھر اسی فنی تسلسل کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگئے جو تقسیم سے قبل قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا ان کے سامنے ریاستی قومی اور بین الاقوامی سطح پر نئے رجحانات اور میلانات کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی ایک توانا روایت موجود تھی مگر تقسیم کے واقعات کی بازگشت ان کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں ضرور سنائی دیتی ہے۔

ریاست جموں کشمیر میں افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۱ء کے آس پاس ہوئی۔ پریم ناتھ پردیسی ریاست کا پہلا افسانہ نگار تھا۔ اس کے بعد یہاں قدرت اللہ شہاب، کرشن چندر پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی اور مہندر ناتھ نے اس فن کو آگے بڑھایا۔ تقسیم کے بعد سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، موہن یاور، غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین، نور شاہ، رام کمار ابرول، ویدراہی بھگوت پرساد ساٹھے، رام ناتھ شاستری، نریندر کھجوریہ، ڈی سی پرشانت، مدن موہن شرما، این ڈی جموال، بندھو شرما، پریم سنگھ، کنول کشمیری، سرن سنگھ اور کئی دوسرے افسانہ نگاروں نے فن کے جوہر دکھائے اور اس جوت کو جگائے رکھا۔ ان میں سے بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو سے کیا اور پھر کشمیری، ڈوگری اور پنجابی کی طرف مائل ہوئے۔ بعض نے دونوں زبانوں کو وسیلۂ اظہار بنائے رکھا اور ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس قافلہ میں مزید فنکار ملتے گئے۔ چنانچہ جب خالد حسین نے لکھنا شروع کیا تو ان کے سامنے ریاست کی مختلف زبانوں میں افسانے نے ایک روایت قائم کرلی تھی اور مجموعی طور پر دوسری کئی زبانوں کے ساتھ ساتھ قومی سطح پر اردو افسانہ مواد، فن اور روایت کے اعتبار سے گہرائی گیرائی اور زندگی اور فن کے اس صحیح اور رچے ہوئے امتزاج کا عکاس اور ترجمان بن گیا تھا جس میں فن کی لطافتیں اور نزاکتیں بھی ملتی ہیں اور تنوع رنگینی اور جذبے کی گہرائی بھی۔

خالد حسین کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ حقیقت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور رومان کا امتزاج ہیں وہیں ان میں نفسیاتی اور جنسی پیچیدگی، مذہبی وسیاسی عوامل کی کارفرمائی اور معاشی ومعاشرتی مسائل کی عکاسی ایک مخصوص انداز میں کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں پریم چند اور علی عباس حسینی کی طرح مخصوص معاشرے کے دل پذیر مرقعے، کرشن چندر کی رومانیت، شعریت اور رنگینی، منٹو کی طرح تہہ در تہہ جنسی بے راہ روی اور گھٹن اور قرۃ العین حیدر کی طرح تقسیم وطن کا المیہ پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس طرح کی کارفرمائی ان کے وسعتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا لب ولہجہ انداز اور اسلوب منفرد اور مخصوص ہے۔

خالد حسین کے افسانوں میں نہ صرف حسن وجمال اور حقیقت ورومان کا امتزاج پایا جاتا ہے یا سماج میں پنپتے ناسوروں کی عکاسی ہے بلکہ کئی دوسرے مسائل کی نفسیاتی موشگافی، حق گوئی اور بے باکی سے بات کہنے کی جرأت، مصلحانہ طنز، شگفتہ فقرے بازی، محاوروں کا برمحل استعمال اور کہیں کہیں ابہام بھی پایا جاتا ہے۔ اور علامتی واستعاراتی انداز بھی۔

خالد حسین اپنے افسانوں کا مواد اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنے ہی سماج کے لوگوں سے لیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عطر سنگھ:

"خالد حسین کسے ہور پنجابی لیکھک دی نقل نہیں۔ اس نے اپنے لوکاں دی زندگی دی گھٹن، اونہاں دے اندر باہر دے تضاد، اونہاں دی محرومیاں تے مایوسیاں نوں انسانی چوکھٹے وچ بیڑ کے پیش کیتا ہے۔ اس دے اس جتن راہیں پنجابی کہانی کاری نوں ادبی مواد دی درشٹی توں اک نویں وسعت نصیب ہوئی ہے۔ خالد حسین نے بڑے درد نال اپنے ہم وطناں دے احساساں دی نقاشی کیتی ہے۔ میرے نیڑے اس گل دا ملّ اونہاں کہانیاں دے ادبی گن نالوں جے ودھ نہیں۔ تاں کسے دی طرحاں گھٹ نئیں اے" ______ تے جہلم وگدا رہیا۔ ص ۶

"پانی کی لکیریں" افسانے میں انھوں نے جس معمولی واقعے سے کہانی کا تانا بانا تیار

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کر کے ایک اہم مسئلے کو اجاگر کیا ہے وہ ہند پاک سرحد پر رونما ہونے والے روزمرہ واقعات کا ایک حصہ ہے۔ اس کہانی میں دو پاکستانی بچوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو پتنگ لوٹتے لوٹتے ہندوستانی علاقے میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر بیساکھی کا میلہ دیکھنے اور بوبی فلم دیکھنے کے بعد واپسی پر سرحدی حفاظتی پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں اور پھر انسپکٹر رندھاوا انہیں معصوم جان کر واپس بھیج دیتے ہیں۔

خالد حسین ایسے معمولی واقعات کو کہانی کا موضوع بنا کر انسانیت کے کھوئے ہوئے رشتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "بیڑے کی لنکا"۔ "دل کی گلیاں"۔ "دشمن کون"۔ "دھرتی روتی ہے"۔ "انتظار کا قیدی"۔ "کوئلہ بھئی نہ راکھ" جیسے افسانوں میں اسی قسم کے انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ ایک عام انسان کے جذبات واحساسات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ یہاں سب انسان برابر ہیں اور ان کے جذبات واحساسات ان کی امیدیں اور آرزوئیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں خواہ وہ ہندوستان کے رہنے والے ہوں یا کسی اور دیش کے، ان کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ خالد کے یہ افسانے ایک مشترکہ انسانی رشتے اور ان کے مشترکہ دکھ درد کے نمائندے ہیں۔ — "مہری"۔ "اشتہاروں والی حویلی"۔ "گرداب"۔ "ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں"۔ "دیواروں میں چھپی واسنا"۔ "آہ وزاریاں"۔ "اجالے کی تاریکی" اور "کھلی مٹھی" جیسے افسانے انسان کے نفسیاتی اور جنسی مسائل کے ترجمان ہیں۔ ان افسانوں میں خالد نے عام انسانی کمزوریوں کا بڑی فنکارانہ چابکدستی سے تجزیہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض افسانے منٹو کے ان افسانوں کی یاد دلاتے ہیں جن میں جنسی ہیجان اور انگیخت کے بجائے جذبات نہ صرف سرد اور مدھم پڑ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو انسان پر ایسے جذبات وخواہشات پیدا ہونے پر نفرت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ "مہری" افسانہ ان ہی جذبات سے مملو ہے۔

خالد کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا صاف اور شستہ انداز بیان ہے انھوں نے زندگی کے مسائل کا بہت نزدیکی اور گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان مسائل میں سے جس کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اسے اسلوب سے اس طرح نبھایا ہے کہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ فن کا ایک عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔ "مہری" افسانے میں بلاشبہ گوجر سماج کی عکاسی کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ایک جنس زدہ کلرک کی جنسی بھوک کو ہمدردی کے جذبات میں بڑے فنکارانہ انداز میں تبدیل کرنے کا فن نبھایا ہے۔ "ادھورا تاج محل" آج کے نوجوانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ "بالن ہڈ ملبن" میں نوجوان نسل کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ "ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں کشمیری ماحول اور سیاحوں کی تعیش پرستی پر مبنی افسانہ ہے۔" آہ وزاریاں" ہمارے ہر گھر کی کہانی ہے۔ بیٹی، ماں، بہو اور ساس کے ہر رشتے کی کہانی ہے اور ان کی محبت اور غرض کے جذبات سے ابھاری گئی یہ کہانی صدیوں سے چلی آرہی ہے اور مستقبل میں بھی ہمیشہ جاری رہے گی۔

خالد حسین کا مشاہدہ ہمہ گیر ہے۔ وہ جس ماحول پر نگاہ ڈالتے ہیں اس کے باریک سے باریک پہلو کو بھی اپنی نگاہ میں رکھ کر اپنے افسانوں کا پس منظر بناتے ہیں اور پھر قاری کے ذہن پر گہرا نقش اور تاثر قائم کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قاری افسانہ نگار کے مشاہدے اس کے تخیلِ فکر اور تجربۂ حیات کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔" اشتہاروں والی حویلی" "شردھالو" "کھوکھلا سورج" "سورج کا گیت" "بجھا چراغ" جیسے افسانے اسی طرح کے مشاہدے اور تجربے کے آئینہ دار ہیں۔

خالد حسین منٹو کی طرح اپنے افسانوں کی تمہید باندھتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کے ذہن پر ایک گہرا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ابتدا رہی میں فنکار کی گرفت میں آجاتا ہے اور بصد اشتیاق افسانے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جو کہ افسانہ نگار کی کامیابی ہے۔ یہاں مجھے خالد منٹو سے کافی متاثر دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے منٹو کی اسی افسانوی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ افسانے تک پہنچانے کا ان کا اپنا الگ انداز ہے۔ مگر کہانی کی ابتدا اور انتہا جن نزاکتوں کے برتنے کا تقاضہ کرتی ہیں۔ خالد منطقی اور فنی حیثیت سے وہ سب تقاضے پورے کرتے ہیں۔ خالد کی کہانی ابتدا رمیں ہی قاری کو اپنے قابو میں کر لیتی ہے اور وہ اشتیاق سے اگلی سطور کی جانب بڑھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند افسانوں کی تمہیدیں اور انجام۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تمہید ـــــــ "اس حویلی کا نام اکرام منزل تھا ــــ اس محلہ کی تین چار بڑی حویلیوں میں سے ایک حویلی ــــ اکرام منزل ــــ مستری انعام کھوکھر کی حویلی ــــ محنت مزدوری، عقل سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کے چونے گارے سے بنی یہ حویلی آج بھی مستری انعام کھوکھر کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے مستری انعام کھوکھر کو ــــ اپنے زمانے کی مشہور ہستی تھے ــــ"

انجام ـــــــ "وہ اپنے سر مسجدوں کے میناروں سے بھی اونچے کر کے چلنے لگے۔ صرف اکرام منزل کا گونگا کردار غائب تھا۔ اسے کسی نے ڈھونڈا بھی نہیں۔ شاید وہ حویلی کے ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ اور مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا تھا۔"

ـــــــ (اشتہاروں والی حویلی)

"بیڑے کی لنکا" کی تمہید۔ "بیڑے کی لنکا کھڑی ہے۔ بڑے بڑے حادثوں بھونچالوں اور طوفانوں کے باوجود بھی ــــ یہ کوئی راون کی لنکا نہیں جسے کوئی اجودھیا کا رام آ کے ڈھا جائے۔ یہ تو بیڑے کی لنکا ہے۔ دو کچے کمرے ایک پکی بیٹھک اور تھوڑا سا آنگن ــــ اس لنکا کی کل کائنات ہے۔ بیڑے کی لنکا میں آب و ہوا سخت گرم اور سخت سردی رہتی ہے۔ یہ معتدل کبھی نہیں رہی۔ یہ لنکا اس عظیم بستی میں کھڑی ہے جسے کبھی محلہ استاد غوث محمد خاں کہتے تھے۔ پر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس محلے کی ساری شان و شوکت غیرت اور عزت کو مٹا کر رکھ دیا اور اس محلے کا نام سکڑ کر صرف استاد محلہ رہ گیا ــــ"

تمہید ـــــــ "میں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ میں پیوندکاری

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں ماہر ہوں — یہ کہانی بھی میں ٹکڑوں ہی میں بیان کرنے جا رہا ہوں۔ آپ میرا یقین کرلیں کہ یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جُڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی — ایک کہانی — کئی ٹکڑے — چھوٹے بڑے، ضروری، غیر ضروری ٹکڑے — اور یہ پہلا ٹکڑا۔ —" (کھوکھلا سورج)

اس تمہید کے بعد قاری بڑے انہماک کے ساتھ کہانی پڑھنا شروع کرتا ہے۔ اور پھر یہ تاثر اور انہماک تب ٹوٹتا ہے جب وہ ان سطور پر پہنچتا ہے:۔

اختتام

"سلگتے دھوئیں کی پُراسرار آواز سے کمرۂ عدالت میں ایک گہرا شگاف پڑ گیا اور مریم کی پسلی سے جنم لینے والا ہمایہ مریم کو ساتھ لیکر اس میں سما گیا — اور جج فاروق — ایک مفلس، قلاش سب کچھ لٹا کر کرسی سے اٹھا اور رنگین مناروں والے شہر میں گم ہو گیا — قارئین! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟ بتائیے نا! ان ٹکڑوں کی پیوند کاری سے کہانی بنتی ہے یا نہیں؟۔"

کنوار گندل سے اقتباس

" کل رات جو تند ہوائیں چلیں، جو طوفان آیا، جو بجلی گری کیا آپ جانتے ہیں اس میں کس کس کا گھر اجڑ گیا — نہیں جانتے؟ بھلا آپ کو کیونکر پتہ ہو۔ یہاں کون کسی کی خبر رکھتا ہے۔ یہاں تو سبھی اپنے اپنے شیش محلوں میں مست رہتے ہیں۔"

افسانے کی اس تمہید کے بعد قاری فنکار سے پوری روئداد سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے اور اس کا یہ تجسس اور شوق اس اقتباس تک قائم رہتا ہے:

" جاجی کو دھتورہ کھاتے دیکھ کر گُلاں بہت خوش ہوئی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی سے جامی ترکھان کا مکان، مکان کے اندر لگا جامن کا پیڑ، پیڑ پر بیٹھے پنچھی —— کانپ اٹھے —— جولاہوں کی بستی میں بجلی ایک بار پھر کوندی، پر اب کے مکان نہیں گرے —— کوئی جھونپڑی برق کی زد میں نہیں آئی۔ صرف گرجتی بجلی کی چمک میں جاجی کے وجود سے دھواں اٹھتے سب نے دیکھا۔"

اور اب آخری اقتباس "گوری فصل کے سوداگر" سے

تمہید —— "برگد کا سیاہ بوڑھا پیڑ رات کی تاریکیوں میں اپنے ذہن و عقل کے دریچوں کو مقفل کر کے ایک پراسرار کھیل میں الجھ کے رہ جاتا ہے اور ہر صبح وادیٔ گل پوش کے کسی گل کی طرح حسین گرم سورج کی ٹھنڈی کرنوں سے دُھلا اس کا چہرہ —— ہر شخص اس کے لمس کو پانے کی خواہش میں رہتا ہے۔"

انجام —— اور ایک دن —— ریت کے صحرا میں کھڑا ویران اداس سوکھا بے برگ برگد طوفان کی زد میں آگیا —— وہ تیز آندھی میں اپنے وجود کو نہ سنبھال سکا —— وہ گر پڑا —— وہ ختم ہو گیا —— ہمیشہ کے لئے —— اور تسکین کا سامان ہو گیا —— اندھے اعتقاد کی دیواریں توڑنے والوں کے لئے۔ کچے رنگوں کے پیراہن مسکرانے لگے، گنگنانے لگے کہ شاید اب رُت بدلے گی اور لالہ کے پھول کھلیں گے۔"

خالد کے افسانوں میں اس قسم کی تمہید قاری کو افسانے کی ابتدا میں ہی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور پھر کہانی انجام تک اسے اپنے ساتھ لئے ان تمام مناظر کی سیر کراتی ہے جو کہ افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی ہے۔ افسانہ آغاز اور انجام کے جن مراحل کا متقاضی ہے اسے پورا کرنا خالد کو بخوبی آتا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خالد حسین کے کچھ افسانے علامتی اور استعاراتی انداز لئے ہوئے ہیں۔"امرود کا پیڑ"۔ "گھاس پر چلنا منع ہے"۔ "گوری فصل کے سوداگر"، "نئے آدم کا خواب"۔ "صلیب ذات"۔ "بھوشیہ وانی"۔ "اندھیر نگری"۔ "دھرتی روتی ہے"۔ علامتی افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں خالد حسین نے موجودہ سائنسی اور ٹیکنیکی دور کے انسان کے کرب اور بے چینی کو استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خالد حسین نے اگرچہ پنجابی اور اردو میں کہانیاں لکھی ہیں مگر ان کی بعض کہانیاں ہندی دانی کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں۔ شردھالو، سیاست، عیبی خلقت کے بے عیب کارنامے، بھوشیہ وانی اور راج سنگھاسن ڈانواڈول، اسی زمرے میں آنے والی کہانیاں ہیں۔ اسی طرح "مہری" میں خالد حسین نے ڈوگری زبان کا بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

علاوہ ازیں خالد نے اپنی بیشتر کہانیوں میں سیاست اور اس کی پینترے بازیوں سے پیدا شدہ نتائج کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور موجودہ نظام پر کاری ضربیں لگائی ہیں۔ وہ سیاست کی چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والے معصوم عوام کے درد کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اس کے ردعمل سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ دل کی گلیاں اور دشمن کون، تقسیم ملک کے موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں اور ان کے کردار بھی بری طرح سیاست کی کارفرمائی کا شکار دکھائے گئے ہیں۔ دل کی گلیاں کا بابا اپنے وطن کو بھلا نہیں پا رہا حالانکہ اس کا سارا خاندان پاکستان چلا گیا ہے۔ "دشمن کون" میں ہند پاک سرحد پر تعینات فوجی دیوالی اور عید کے تہواروں پر آپس میں مٹھائیاں اور پھل بانٹ کر آپسی بھائی چارہ کا اظہار کرتے ہیں جبکہ سیاست داں، جنگ و جدل کے بیانات دے رہے ہیں۔ آپسی محبت اور بھائی چارے کا نقشہ کیسے خوبصورت الفاظ میں کھینچا ہے۔

"دونوں بڑی گرم جوشی سے گلے ملے، میں نے دیکھا کہ وہ نہیں مل رہے تھے بلکہ ان کی تہذیب گلے مل رہی تھی، ان کے دل گلے مل رہے تھے۔ وہ دل جو ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں سے راوی اور چناب بہنے لگے۔"

"مجاہد" ایک ایسے معصوم مزدور کی کہانی ہے جو شاید مجاہد کے معنی سے بھی واقف

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نہیں لیکن مذہب اور سیاست کے اجارہ داروں کے ہتھکنڈوں کا شکار بن جاتا ہے۔

جہاں تک خالد کے افسانوں کی زبان کا تعلق ہے وہ نہایت شگفتہ، رواں، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ لیکن یہ بات کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ زبان کا جو چٹخارہ پنجابی کہانیوں کا حسن دوبالا کرتا ہے وہ اردو میں کہیں کہیں ماند پڑ گیا ہے۔ وہ جملوں کی تراش خراش اور بندش سے منظر کشی اور مصوری کے خوبصورت پیکر تراشتے ہیں۔ ان کے افسانے موضوع کی وسعت اور ہمہ گیری مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی اور فکر و فن کی گیرائی کا مظہر ہیں۔ وہ حسب ضرورت اعتدال و توازن سے کام لیتے ہوئے جزئیات کی تلاش و جستجو میں ایجاز استعارے کنائے اور طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بعض افسانوں میں ایسے مناظر اور مرقعے پیش کئے ہیں کہ قاری کے دل و دماغ پر تا دیر تاثر قائم رہتا ہے۔ مثلاً،

"بکری کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہی معصوم اور پیارے میمنے نے جو میمانے کی پہلی آواز نکالی اس پر بستی کے رہنے والوں میں ایک عجیب بحث چھڑ گئی کچھ عقلمند جانور کہنے لگے، یہ دنیا کی بے ثباتی پر رو رہا ہے۔ کچھ نے میمنے کے ممیانے کو فطری عمل قرار دیا۔ بھیڑیے جو گنتی میں تو بہت کم تھے لیکن اپنی مکارانہ چالوں سے جنھوں نے بستی میں دہشت پھیلا رکھی تھی، کہنے لگے "اس میمنے نے گالی دی ہے، یہ بدلشی نسل کا میمنا ہے۔ ان کی ساری نسل غدار ہے یہ کھاتے ہمارا ہیں اور گن دوسری بستی والوں کا گاتے ہیں۔ ان کے من کالے ہیں۔ یہ اپنی الگ حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، یہ قومی دھارے میں ضم ہونا نہیں چاہتے۔"

(دھرتی روتی ہے)

"ہر شخص دیواروں کا محتاج ہے۔ دیواریں تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لئے ـــــ کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اڑان بھرنے کے لئے ـــــ دیواریں...... مقصد پورا ہونے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لئے...... اور دیواریں...... بہار رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لئے...... دیواریں...... شبنم کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

قطروں سے بچاؤ کے لئے جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتے ہیں۔"

(دیواروں میں چھپی واسنا)

"وقت کسی پہاڑی پگڈنڈی کا مسافر تھک کر چور ہو گیا تھا۔ سمندر کی لہریں پھر پرسکون ہو گئی تھیں۔ چیخیں بادلوں کو چیر کر رحم کے دیوتا کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ آسمان پر چیلیں اڑنا بند ہو گئی تھیں۔"

"وقت ایک ایسے جنگل کی مانند میرے سامنے پھیلا ہوا تھا جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھیں تھک چکی تھیں۔"

(کوئلہ بھئی نہ راکھ)

"خالد حسین نے جب بھی کسی موضوع کا انتخاب کیا ہے تو اسی ماحول کو مد نظر رکھ کر کئی کئی دن تک اس پر کام کیا ہے تبھی اسے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گرد و پیش کے معاشرتی سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کھردرے پن کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے عمل میں وہ موضوعی پیش کش سے زیادہ شخصی تاثر پذیری کی دریافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس طرح افسانہ اپنی تخلیقی حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ فن کے مروجہ لوازمات کو سختی سے پورا نہ کرتے ہوئے بھی افسانہ اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے اس لئے یہ فنکار کے داخلی وجود سے برآمد ہوتا ہے اور اس کے فکر و نظر کی سچائی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی شکل و صورت بھی خود متعین کرتا ہے[۱]۔"

خالد حسین نے اپنے افسانے کے فن، اور اس کی تکنیک کو سمجھنے اور برتنے کی بڑی کامیاب کوششیں کی ہیں اور بعض افسانوں میں اگرچہ وہ اسے پورے طریقے سے نبھا نہیں سکے ہیں تو کیا ہوا کہ فنکار کی کامیابی اسی میں ہے کہ اس کی اگلی تخلیق پہلے سے بہتر بلکہ بہترین ہو اور وہ اسی امید میں فن کی تخلیق کرتا رہے کہ اس نے ابھی تک

---

۱ ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں ص۶ حامدی کاشمیری۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

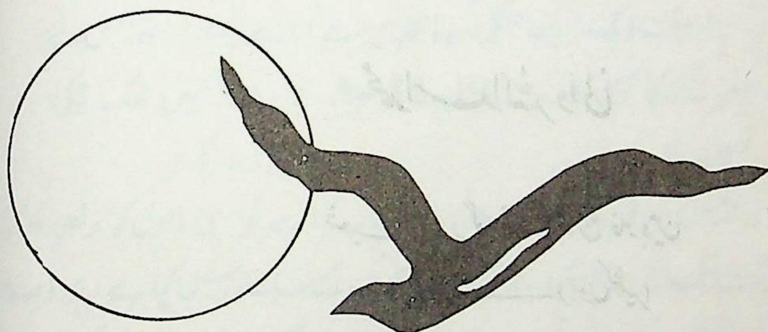
اپنی بہترین کہانی نہیں لکھی ہے ۔ اور جب وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اپنی شاہکار تخلیق وجود میں لے آیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کے تخلیقی سر چشمے خشک ہو گئے ہیں ۔ اور یہی فنکار کی موت ہے ——— میرے خیال میں خالد حسین کے پاس کہنے کے لئے اور اسے تخلیقی صورت دینے کے لئے اتنا مواد ہے کہ اس کے تخلیقی سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے ۔

محمد اسد اللہ وانی

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج فار ویمن
جموں ——— (جموں کشمیر)

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سورج کے تعاقب میں



CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں اور میری تخلیق

میں ___ یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو اُدھم پور میں پیدا ہوا۔ ماں کے دودھ کی بتیس دھاریں بھی پوری طرح نہیں پی تھیں کہ سیاست دانوں کی کرامات رنگ لائیں۔ ملک تقسیم ہوا۔ ایک طوفان اٹھا اور انسان کا لہو پانی بن گیا۔ انسانیت مر گئی۔ سیاست دانوں نے اپنے نجی مقاصد کی تکمیل کے لئے مذہبی جنون کو خوب اُبھارا۔ ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی اور اس میں اُدھمپور کے ایک انسان ماسٹر غلام حسین، چچا ماسٹر عبدالکریم عیوق اور عبدالقیوم سب نفرت کی آندھی میں فنا ہو گئے۔ ہنستا بستا گھر اُجڑ گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا ___ لیکن زندگی کے دشوار گزار راستوں پر بھٹکنے کے لئے زندہ رہ گیا ___ خالد حسین۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد زندگی اپنے ہی کندھوں کا بوجھ بن گئی۔ کوئی سہارا نہ رہا ___ رشتوں کو جب عملی کسوٹی پر پرکھا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ رشتہ دار تو لکڑیاں ہوتے ہیں۔ پاس ہوں تو جلتے ہیں اور دور ہوں تو دھواں دیتے ہیں ___ کئی سال ریفوجی کیمپوں میں ٹھوکریں کھائیں۔ پھر ایک عرصہ تک کرائے کے مکانوں میں گذر بسر کرتے رہے ___ ماں نے بڑی مصیبتیں جھیل کر پالا۔ پڑھایا، لکھایا اور روزگار کے قابل بنایا ___ لیکن بچپن میں یتیمی کی جو مار پڑی اس نے بے حد جذباتی بنا دیا۔ حقارت نفرت اور غربت کے ماحول اور محرومیوں کے احساس میں پلا خالد حسین اپنے لاشعور میں زندگی کے کڑوے پن کو پالتا رہا۔ سماج کے ناسور گنتا رہا۔ پاس پڑوس میں جو واقعات حادثات ہوتے رہے، میں وہ دیکھتا رہا۔ ان میں سے اکثر واقعات میرے من پر گہرا نقش چھوڑ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گئے۔ اور میں نے انھیں اپنے افسانوں کے ذریعہ قارئین تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

۱۲ر جنوری ۱۹۶۴ء کو میری شادی تحصیل رام نگر کے موضع لاٹی دھونہ (بلاک ڈوڈو بسنت گڑھ) کے سعید اللہ ملک صاحب کی دختر سے ہوئی۔ میری رفیقۂ حیات کا نام "نسیم فردوس" ہے، جس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں میں میرا پورا پورا ساتھ دیا۔ اللہ کے کرم سے ہمارے چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔

برسوں کی جدوجہد کے بعد بفضلِ ربی آج پھر ہمارا ایک ہنستا کھیلتا گھر ہے۔ لیکن ایک خدشہ ذہن میں پلتا رہتا ہے۔ ایک دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدانخواستہ تباہی پھر ہمارا مقدر نہ بنے، ہم پھر کہیں ماضی کو نہ دہرائیں۔ کیونکہ بقول شیخ سعدیؔ، وہ زمین ہمیشہ برباد ہوتی ہے جہاں فسادی لوگ پیدا ہوں۔ اور آج بھی یہ فسادی لوگ پورے دیش میں ایک ناسور کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہب، رنگ، نسل، زبان اور قومیت کے زبردست تضاد نے آج بھی ہمارے ملک میں لوگوں کے درمیان بہت بڑی خلیج پیدا کی ہوئی ہے اس خلیج کو پاٹنا شاید کسی کے بس میں نہیں رہا۔ کیونکہ نفرت کے بیجوں سے محبت نہیں اگا کرتی —— وفاداری یا غدّاری —— مذہب، رنگ، نسل یا زبان کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ وفاداری اعتماد سے جنم لیتی ہے، اور غدّاری شک کی کوکھ میں پلتی ہے۔ ملک میں پھیلے اس انتشار اور خوف زدہ ماحول کے باوجود میں پناہ کی خاطر کسی فلسفے کے سائبان میں چھپنا نہیں چاہتا کیونکہ میں زندگی کی عملی حقیقت سے واقف ہوں۔

میری بیوی صورت کی اچھی ہے، سیرت کی خوب ہے لیکن ایک ادیب کے ناطے میں اس کے دماغ کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتا۔ اگر یہ جملہ اسے ناگوار گذرے تو وہ مجھے معاف کردے۔ اس سے پہلے بھی تو وہ میری غلطیاں اور خرمستیاں معاف کرتی آئی ہے۔ میں یہ سچ کہنے پر مجبور ہوں کہ میری بیوی کا میرے ادیب بننے میں کوئی ہاتھ نہیں۔ کسی اور محترمہ کا ہو تو کیسے کہوں۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے میں لکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ آج تک اس "گھر والی" نے مجھ سے کبھی میرا افسانہ نہیں سنا۔ کبھی مجھ سے ادبی بحث و مباحثہ نہیں کیا۔ اس کا فرمانا ہے کہ یہ سب فضول بکواس

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہے۔ وہ مجھے نصیحت کرتی رہتی ہے کہ فضول لکھنا پڑھنا اور بحث کرنا چھوڑ دو۔ پاگل ہو جاؤ گے پھر میرا اور بچوں کا کیا بنے گا ـــــ ایک بار میں حسب عادت رات گئے بستر پہ بیٹھا ایک افسانہ لکھ رہا تھا۔ رات کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ میں لکھتے لکھتے رُک گیا۔ ایک لفظ میرے ذہن سے اتر گیا تھا "لنگری" میں نے دماغ پر بڑا زور ڈالا مگر لفظ قلم کی زد میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں نے اپنی بیوی کو جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پوچھنے لگی، "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کون آیا؟" میں نے اسے حکمتِ عملی سے شانت کیا اور پوچھا کہ نمک مرچ پیسنے والی کُنڈی کو ٹھیٹھ پنجابی میں بھلا کیا کہتے ہیں۔؟

اس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا ـــ "کیوں؟" ـــ میں نے جواب دیا ـــ "کہانی لکھ رہا ہوں۔ لفظ گم ہو گیا ہے۔ سوچا شاید تم ڈھونڈ کر دے سکو گی"۔ـــ اس نے بڑی بے رُخی سے گردن جھٹکی اور دائیں طرف پلٹ کر سو گئی ـــ صبح اٹھتے ہی اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر رات والی حرکت پھر کبھی دوہرائی تو بہت برا ہو گا۔ اس نے بھیانک نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کی ساری ذمہ داری خالد حسین کے سر ہو گی۔ میں نے خاموشی سے دھمکی جیب میں ڈال لی اور آج تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ آپ مجھے داد دیں کہ اتنی بڑی چٹان کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر بھی میری صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا اور میں ایک ادیب بن گیا۔ اللہ جانے اچھا یا بُرا۔

میری تخلیق کا خمیر سماج کے آٹے سے گُندھا ہوتا ہے۔ اِس لئے کہ ادیب بنیادی طور پر سماج کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے، سماج میں رونما ہونے والے واقعات، عوام کے اقتصادی و سیاسی مسائل اور دیگر حالات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی نظر گہری ہوتی ہے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ زندگی کو دیکھتا ہے۔ باریک بینی سے اس کا مشاہدہ کرتا ہے وہ زندگی کے کچے پکے رنگوں کو پرکھتا ہے کیونکہ ان رنگوں میں اس کا اپنا لہو بھی شامل ہوتا ہے لہذا اس کے ذہن و دل میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ اسے فنکارانہ چابکدستی (CRAFTSMANSHIP) سے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میری دانست میں سچا ادیب و فنکار نئے احساس اور نئی آواز کے ساتھ ادبی میدان میں اترتا ہے۔ اس کے لئے ادب کبھی نیا یا پرانا نہیں ہوتا۔ ہاں! لوگوں کے مسائل ضرور نئے ہوتے ہیں۔ جو وقت گذرنے اور سماجی و سیاسی قدریں بدلنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ اُن مسائل کی نشاندہی کرے۔ زندگی کے سچ کو پیش کرے۔ ادب اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی اثرات کا جائزہ لینے کا نام ہے۔ لوگوں کی بات کرنے کا نام ہے۔

میں نے بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنے وقت کی بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ماحول کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، یہ میرے قارئین یا نقاد بھائی ہی بتا سکتے ہیں۔

انسانی زندگی کے احساس کی خوبصورت پیش کاری اچھی تخلیق کی پہچان ہے۔ ادب ذاتی FRUSTRATION یا مایوسی کا نام نہیں۔ اچھا ادب تو ایک شیشہ ہے جس میں قاری کو اپنا اور اپنے سماج کا چہرہ دکھائی دینا چاہیئے

افسانے کے بارے میں راجندر سنگھ بیدی نے کہا تھا کہ افسانہ شاعری کے بہت نزدیک ہے اور مختصر کہانی لمبی بحر کی ایک خوبصورت نظم ہوتی ہے۔ میں نے بھی اپنی مختصر کہانیوں کو لمبی بحر کی نظمیں بنانے کی سعی کی ہے۔ اور یہ افسانوی نظمیں میں اپنے قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

خالد حسین

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کنوار گندل

کل رات جو تُند ہوائیں چلیں، جو طوفان آیا، جو بجلی گری ــــ کیاآپ
جانتے ہیں کہ اس میں کس کس کا گھر اجڑ گیا؟۔ نہیں جانتے؟ ــــ بھلا! آپ کو کیونکر
پتہ ہو۔ یہاں کون کسی کی خبر رکھتا ہے۔ یہاں تو سبھی اپنے اپنے شیش محلوں میں مست
رہتے ہیں۔ خیر ــــ آئیے! میں آپ کو بتاؤں کہ کل رات کی آندھی میں جولاہوں کی
بستی کا کون کون سا گھر اُجڑا۔ کہاں کہاں بجلی گری۔ کس کس کی جھونپڑی تباہ ہوئی۔
کن کن مکانوں کی دیواریں گریں۔ ملبے کے نیچے دب کر کون کون مرا۔؟ سائیں منگلا!
ہاں! وہی جو تعویذ دھاگہ دینے کا دھندہ کرتا تھا اور اللہ ہُو کی پھونکیں مارتا تھا ــــ
اس کا تکیہ جل گیا ــــ اور وہ چنڈو کے کش لیتا لیتا ہمیشہ کے لئے اللہ ہُو ہوگیا ــــ
آشا نائن کی جھگی، شیدے ٹھٹھیرے کی جھونپڑی، ملکھی رام کی دوکان، غلام پانڈی کا
کوٹھا ــــ سب ڈھیر ہو گئے۔ اور بجلی، جامی ترکھان کے مکان پر بھی گری ــــ جس کے
ایک کمرے میں گلاں سوئی پڑی تھی۔ گلاں ــــ جامی ترکھان کی چھوٹی بہو۔ نصیرے
کی بیوی، جاجی کی بھاوج۔ جاجی کی بھاوج پر بجلی گرنے سے جامی کا مکان جلا نہیں، گرا بھی نہیں ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

صرف وہ کمرہ لرز گیا، جس میں پڑی ایک چارپائی پر گلاں مست نیند میں سوئی ہوئی تھی کیونکہ بجلی سیدھی گلاں پر ہی گری تھی ـــــ گلاں پر گرنے والی بجلی سے چارپائی کی چولیں ہل گئیں۔ آنگن میں لگا جامن کا پیڑ چیخا۔ پر آندھی اور طوفان کی وجہ سے دھند بکھری ہوئی تھی۔ اس کی شاں شاں کرتی چیخیں، کسی نے نہیں سنیں۔ بجلی اپنا کام کر گئی۔ گلاں کا سارا جسم جھلس گیا۔

گلاں ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی سب فرقہ وارانہ بلووں میں ختم ہو چکے تھے۔ کسی دور کے ماموں کے گھر پلی گلاں ـــــ نمک، مرچ، اچار کے ساتھ ساتھ باسی سوکھی روٹیاں کھانے اور جھڑکیوں پھٹکاروں اور گالیوں کی لسی پینے کے باوجود بھی جنگلی پھول کی طرح خوب کھلی ـــــ جب اس کا جوبن میلے کپڑوں میں اٹھکھیلیاں کرنے لگا اور وہ دھرتی پر تارے لٹانے لگی تو اس کے ماموں نے جامی ترکھان کے چھوٹے لڑکے نصیرے کے ساتھ نمکین چائے اور عربی کھجوروں پر گلاں کا رشتہ جوڑ دیا ـــــ گلاں دلہن بن کر جولاہوں کی بستی میں آ گئی۔ وہ نئے گھر اور نئے ماحول میں آ کر خوش تھی۔ کیونکہ یہاں اسے پیار ملتا تھا، لیکن کبھی کبھی اس پیار کی گرمی کو نصیرا شرابی بنکر ٹھنڈا کر دیتا۔ جولاہوں کی بستی میں دیسی شراب کی سرکاری دکان کے علاوہ اڑوس پڑوس میں ناجائز شراب کی کئی بھٹیاں ہونے کی وجہ سے ویسے تو سارا گاؤں شراب کا شوقین تھا، پر نصیرا جتنا کھل کر رندا پھیرتا، اتنی ہی کھل کر شراب بھی پیتا۔

گلاں کے روکنے اور ٹوکنے پر اس سے جھگڑا کرنے لگتا اور نشیلے غصے میں گالیوں سے بھری ٹوکریاں خالی کر دیتا۔ اس طرح گھر کے میٹھے ماحول میں پھیکا پن آ جاتا۔ پھر سہاگ کا سرخ جوڑا پھٹنے کے ساتھ ساتھ گلاں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگی۔ یوں گالی گلوچ کے کاگ لڑتے رہتے۔ کبھی کبھار دونوں میں ہاتھاپائی تک کی نوبت آ جاتی۔ تھپڑ، مکے اور لاتیں کھا کر گلاں رونے لگتی اور نصیرے کو جی بھر کے بددعائیں دیتی نصیرے کی ماں اسے پکڑتی۔ کبھی اسے برا بھلا کہتی اور کبھی اپنی کوکھ کو کوستی۔ ہمسائے منڈیروں پر چڑھ کر تماشہ دیکھتے۔ آخر گلاں کا جیٹھ جاجی نصیرے کی عقل ٹھکانے لگاتا۔ اور گھر کی اشانتی کو شانت کر دیتا ـــــ پھر نہ جانے گلاں کی کون سی بددعا نصیرے پر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اثر کر گئی کہ وہ مرافوں کے گھر الماریاں بنانے کے لئے آرے پر لکڑی کیا چرانے گیا کہ چلتی مشین کا پٹہ ٹوٹا اور اس کے بھی ٹکڑے کر گیا ـــــ نصیرے کی لاش کو دیکھ کر گلاں نے جو بین کئے، اس سے ساری بستی کا دِل دہل گیا۔ وہ چھاتی پیٹنے لگی۔ اس نے سر کے بال نوچ ڈالے وہ اپنے تین سال کے گلزارے اور ایک سال کے یوسفے کو بار بار گلے لگاتی اور ان کی یتیمی کا مرثیہ پڑھتی جاتی۔ لاش کو غسل دینے، کفن پہنانے اور جنازہ لے جانے تک وہ کئی بار بیہوش ہوئی۔ عورتیں اسے دلاسہ دیتی جاتیں، اور خود بھی روتی جاتیں۔ نصیرا ابھی اٹھائیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت عزرائیل نے اس کی روح قبض کر لی۔ نصیرے کی بے وقت موت کی وجہ سے اس کے جنازے میں سارے بستی والے شامل ہوئے۔ کلمۂ شہادت کی آوازوں کے ساتھ جنازہ نکلا اور دعائے مغفرت کے ساتھ نصیرے کو قبر میں دفنا کر لوگ گھروں کو واپس آئے۔ نصیرے کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد اس کی ماں بے چاری بھی اللہ کو پیاری ہو گئی اور اس طرح گھر کی حکومت پوری طرح جاجی کے ہاتھ آگئی۔

گلاں کچھ دیر کے لئے جم سی گئی۔ گھر کی چیزیں، مکان کے کمرے، کمرے کی دیواریں، آنگن میں لگا جامن کا پیڑ ـــــ سب اسے اپنی طرح اداس لگتے۔ کئی بار اس کی آنکھوں کے سامنے نصیرے کا چہرہ گھومنے لگتا جو اس کے ساتھ باتیں کرتا، اسے گالیاں دیتا۔ اسے نصیرے کا شرابی پن، گالیاں، گھونسے، تھپیڑ ـــــ سارے روپ اچھے لگنے لگتے وہ چاہتی کہ نصیرا اس کے شریر کو نوچے ـــــ لیکن آنکھ جھپکتے ہی گلاں اپنی اصلی حالت میں آجاتی۔ زندگی کی اس بھیڑ میں وہ باہر سے تو صحیح وسالم دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اندر سے وہ ساری کی ساری ٹوٹ ہوئی تھی ـــــ وہ دو بچوں کو کیا کھلائے، ان کو کہاں لے کے جائے، بیوہ جوانی کے دن کیسے گزارے۔ یہ سوچ سوچ کر اس کے چہرے کی لکیروں میں بل پڑ گئے۔ وہ فکروں کی جھاڑیوں میں الجھ گئی، اس کی آتما پریشان ہو گئی۔ ایسی ہی حالت میں جاجی اسے تسلیاں دینے لگا ـــــ

"گلاں! تو فکر نہ کر۔ نصیرے کے بچے میرے بچے ہیں۔ اس گھر پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا۔ میں کماؤں گا، پہلے تم سب کھاؤ گے پھر ہم کھائیں گے" ـــــ جاجی کے اس ہمدردانہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

راگ میں کئی سُر ملے ہوئے تھے۔ مگر گلاں جاتی بھی کہاں۔ وہ گھر چھوڑ کر در بدر ہونا نہیں چاہتی تھی ـــ اس لئے وہ صبر شکر کر کے بیٹھ گئی ـــ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کی حیثیت آٹے کے چھان بُورے سے زیادہ نہیں ـــ جاجی کی جورو حمیداں ادھرنگ کی ماری کافی عرصہ سے پلنگ پر پڑی تھی مگر اس کی زبان کو تو ادھرنگ نہیں ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی بیٹھی بھی آگ اگلتی رہتی۔ سچ پوچھیں تو اس کی زبان تالو کے ساتھ لگتی ہی نہیں تھی۔ جاجی کی بیٹی نیفاں بھی وقتاً فوقتاً چاچی پر جامن کی گٹھلیاں پھینکتی رہتی۔ یوں مٹی کے برتن آپس میں بجتے رہتے۔ ٹوٹتے رہتے۔ پر جب جامن کے پیڑ کے نیچے سایہ نہ رہا اور جامن کھانے میں بالکل مزہ نہیں رہا تو گلاں نے اپنا چولھا الگ کر لیا۔ وہ سینے پرونے کا کام جانتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بڑے گھروں میں کپڑے اور برتن صاف کر کے وہ گذارے اور یوسفے کو پالنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیٹ کا دوزخ بھی بھرنے لگی۔

حمیداں کے ادھرنگ نے جاجی کی ساری شرافت بھنگ کر دی تھی۔ وہ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کھلی چراگاہوں میں جا کر گھاس چر لیا کرتا تھا، لیکن جب سے نصیرا نیک حوروں کے ہاتھوں شراب طہورا پینے بہشت میں چلا گیا تھا تب سے جاجی کا چنچل من گلاں سنگ چنگ بجانا چاہتا تھا۔ اس کے چرخے پر اپنا سوت کاتنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چادر برداری ایسا کوئی رشتہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ شرع یا قانون والوں، کے اعتراض اٹھانے پر گلاں کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی تیار تھا ـــ جاجی کئی بار آنکھوں میں خماری رنگ بھر کر اور سوکھے ہونٹوں پر چکنی زبان پھیر کر گلاں کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا، گلاں آنکھوں اور ہونٹوں کی بھاشا پڑھ کر چپ رہتی ـــ لیکن ایک دن جب جاجی نے شراب کے نشے میں گلاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دی ـــ تو گلاں نے گھر میں کہرام مچا دیا۔ پاس پڑوس والے ایک بار پھر اپنے اپنے چوباروں پر چڑھ کر تماشہ دیکھنے لگے۔ وہ محلے والوں کو سنا رہی تھی۔

"جیٹھ باپ کی جگہ ہوتا ہے، میں اس کی بیٹی کی طرح ہوں۔ اس نے یہ بات کہنے کی ہمت کیسے کی۔ ایسی بات کرتے اِسے شرم نہیں آتی۔ اتنی ہی آگ لگی ہے تو اپنی نیفاں سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کیوں نہیں کر لیتا شادی۔ چھوٹے بھائی کی بیوہ پر بُری نظر رکھتا ہے۔ خدا کرے یہ کسی گاڑی کے نیچے کٹ مرے۔ حرامی، بدمعاش، سالا۔

گُلاں کو ہنگامہ کرتے دیکھ جاجی گھر سے باہر چلا گیا، پر جولاہوں کی بستی میں یہ بات پھیل گئی کہ جاجی گُلاں کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ محلے کی کچھ عمر رسیدہ جہاندیدہ عورتوں نے گُلاں کو سمجھایا کہ وہ جاجی کی بات مان جائے تاکہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے لیکن گلاں اپنے جسم کو پھر سلگتے تنور میں پھینکنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ صرف یوسفے اور گلزارے کے لئے جی رہی تھی۔ ورنہ اس کی امیدوں اور تمناؤں کا بستا شہر کب کا کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے دل میں آس کے گھنگھرو بجنے کب کے بند ہو چکے تھے۔ دنیا کی ہر شے اس کے لئے بے کار ہو گئی تھی —— جاجی کو یہ یقین ہونے پر کہ اس کی خواہشوں کے بادل جتنی مرضی بارش برسائیں، گلاں کے ٹھنڈے جسم میں پھول نہیں اُگ سکتے —— وہ شکرے باز کی طرح اپنے ناخن تیز کرنے لگا۔ تاکہ موقع ملتے ہی وہ جامن کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی کبوتری کا شکار کر سکے —— اور کل سیاہ کالی رات کو تیز آندھی میں جو بجلی گری، وہ انسانی بجلی —— جاجی کے روپ میں سیدھی گلاں پر ہی گری تھی جس سے گلاں کا سارا جسم جھلس گیا —— گلاں، جو میاں مٹھو کی طرح اپنے آپ کو اس گھر کے پنجرے میں محفوظ سمجھتی تھی، اسے پنجرے میں ہی بلی نے دبوچ لیا۔ کئی دنوں تک گلاں چولھے کی لکڑی کی طرح سُلگتی رہی، جلتی رہی —— پھر اس نے جاجی سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے کُترے پَر پھر اُگ آئے —— وہ پنجرے کی سلاخوں سے باہر نکل آئی —— اور اپنے اندر اُگا ہوا دھتورا —— جاجی کو کھلانے کے لئے تیار ہو گئی۔

جاجی کی بیٹی نیفاں شرع محمدی کے مطابق جوان ہو چکی تھی اس کے بدن پر وہ سارے ہتھیار سج چکے تھے جن سے کوئی بھی شخص زخمی ہو سکتا تھا۔ جبھی تو جاجی نے رشیدے ٹھٹھیرے کے لڑکے جیرے درزی کے ساتھ اس کی شادی کر دی —— گلاں اور نیفاں میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا ایک پھول اور کلی میں ہوتا ہے۔ اور جیرا پچیس سال کا جوان گبرو، اُسے البتہ دریا —— کلی سے سنبھالا نہیں گیا۔ نیفاں کا کوئی بھی ہتھیار جیرے کو زخمی نہیں کر سکا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

شادی کے بعد جیرا سسرال آنے جانے لگا ــــ اور گلاں ــــ نیفاں کی پتنگ کاٹنے کے لئے اپنی ڈور پر مانجھا چڑھانے لگی ــــ اور ایک دن اس کے کُرتے سے جھانکتی ہوئی نائلن کی انگیا نے نیفاں کی پتنگ کو ایسی ٹھنگی ماری پتنگ لوٹ پوٹ ہو کر سیدھی گلاں کے قدموں پر آگری۔ لونگ کے لشکارے سے جیرے کے سارے شریر میں شرارے ناچنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پیاس کے جگنو جھلملا اٹھے۔ بس پھر وہ جھلملاتے جگنو گلاں نے بجھنے نہیں دئے ــــ یوں ابلتا دریا ــــ سارے کا سارا گلاں نے ہضم کرلیا۔ نیفاں بیچاری کو ایک بوند پانی بھی پینے کو نہیں ملا ــــ کہتے ہیں کہ عورت کے لئے دن لوہے کا چھلا ہوتا ہے اور رات سونے کا جھومر۔ لیکن نیفاں کے گھونسلے پر قبضہ جمانے کے بعد گلاں کے لئے دن بھی سونے کی جھانجر تھا اور رات بھی ــــ جیرا اس کے لئے ساون کی میٹھی پھوار بن گیا، اور وہ رم جھم پھوار میں غسل کرنے لگی ــــ وہ دونوں گلو کے واڑے اور شیتلا مندر میں جاکے بیر کھاتے۔ توی اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے۔ باہو، مرالیاں، سروین سر اور ناگ بنی کی ہواؤں میں لہراتے اور کبھی کبھار دل پر جمی گناہ کی گرد کا احساس جاگنے پر وہ پیر بابا کی درگاہ پر جاکر چراغ جلاتے اور جھاڑو دیتے تاکہ گرد صاف ہوجائے۔

نیفاں کی اماں حمیداں، جیرے کو گلاں کے پھولوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر بڑا تڑپی وہ ادھر نگ کی ماری نیفاں کو گلاں کی چارپائی کے نیچے رُلتے دیکھ کر خود پلنگ سے ایسی گری کہ اس کی زبان ہمیشہ کے لئے تالو کے ساتھ جالگی ــــ جاجی نے جیرے کو گلاں کی چادر سے باہر نکالنے کے لئے بہت زور لگایا۔ اس نے جیرے کو پیار سے سمجھایا غصے سے ڈانٹا، مارا پیٹا، لیکن جیرا ایک ضدی بالک ــــ پھول ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ تھک ہار کر جاجی نے جیرے سے کہہ دیا کہ وہ نیفاں کو طلاق دیدے ــ جیرا تیار ہوگیا۔ لیکن گلاں نے جیرے کو طلاق دینے نہیں دیا۔

جاجی کے لئے ساری کائنات بے جان ہوگئی۔ وہ نیفاں کی آنکھوں میں چپ کی زردی دیکھ کر جاگرن کی سولی چڑھتا رہا۔ مگر وہ نیفاں کو درد سہتے اور بھوکا پیاسا مرتے کب تک دیکھتا رہتا ــــ اس نے نیفاں کے ریگستان میں ہریالی لانے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے حلف لیا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کہ وہ کلی مسلنے والوں کو برباد کردیگا۔ اس نے اپنے اندر رُکے ہوئے لاوے کا ڈھکنا اٹھایا اور آنکھوں میں انگارے لے کر گلاں کے سامنے جا کھڑا ہوگیا۔ پر گلاں کے سامنے جلتی آگ کا کوئی بس نہیں چلا۔ اس کی تیکھی مسکان جاجی کے سارے جسم کو ٹھنڈا کر گئی۔ آنکھوں کے انگارے بجھ گئے اور دل کا درد آنسوؤں میں ڈھل گیا۔ اس کا رُواں رُواں نیفاں کے سُکھ کی بھیک مانگنے لگا ـــــــ

"میرے جرم کی سزا نیفاں کو نہ دو۔ اس پر رحم کرو وہ تمھاری بھی تو بیٹی ہے اور بیٹی کا گھر ماں اجاڑتی نہیں۔ مجھے معاف کردو۔ بخش دو۔ جیرے کو آزاد کردو۔"

جاجی کو دھتورا کھاتے دیکھ کر گلاں بہت خوش ہوئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی سے جامی ترکھان کا مکان، مکان کے اندر لگا جامن کا پیڑ، پیڑ پر بیٹھے پنچھی ـــــ کانپ اٹھے۔ جولاہوں کی بستی میں بجلی ایک بار پھر کوندی۔ پر اب کے مکان نہیں گرے۔ کوئی جھونپڑی برق کی زد میں نہیں آئی۔ صرف گرجتی بجلی کی چمک میں جاجی کے وجود سے دھواں اٹھتے سب نے دیکھا ـــــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بیڈے کی لنکا

بیڈے کی لنکا کھڑی ہے ـــــ بڑے بڑے حادثوں، بھونچال اور طوفانوں کے باوجود بھی۔ یہ کوئی راون کی لنکا نہیں، جسے کوئی اجودھیا کا رام آکے ڈھا جائے۔ یہ تو بیڈے کی لنکا ہے۔ دو کچے کمرے، ایک پکی بیٹھک اور تھوڑا سا آنگن اس لنکا کی کل کائنات ہے... بیڈے کی لنکا میں آب و ہوا سخت گرم اور سخت سردی رہتی ہے، یہ معتدل کبھی نہیں رہی۔ یہ لنکا اس عظیم بستی میں کھڑی ہے جسے کبھی محلہ اُستاد غوث محمد خاں کہتے تھے۔ پر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اِس محلہ کی ساری شان و شوکت، غیرت اور عزت کو مٹا کر رکھ دیا اور اس محلہ کا نام سکڑ کر صرف اُستاد محلہ رہ گیا۔

اِس لنکا کے جنوب مغرب کی جانب گاشاں اور جاناں دھوبنوں کا کچا کوٹھا ہے، جن کا نام اب اللہ کے فضل سے دُور دُور تک مشہور ہو چکا ہے۔ بیگاں اور روہلو دھوبی کے کائی لگے کھنڈروں کے لئے گاشاں اور جاناں کے تھرکتے بدن ستونوں کا کام دے رہے ہیں۔ شمال مغرب کی طرف ہلّو چارن کی خود مختار مملکت ہے جو کچھ اصولوں پر سختی سے کاربند ہے۔ ان اصولو کے مطابق ہلّو چارن اپنا کاروبار کبھی بھی اپنے اڑوس پڑوس نہیں چلاتی۔ چاہے کتنی ہی قحط سالی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کیوں نہ ہو، اس نے ہمیشہ اپنا کاروبار اُستاد محلّے کی سرحد سے باہر ہی چلایا۔ گاشاں اور جاناں
کی طرح نہیں کہ محلے کے پرانے غازیوں اور نئے مجاہدوں کو ایک ہی صف میں بٹھا کر گلابی
جشن کراتی پھریں۔

مغرب کی جانب کاکو سبزی والی کا کوٹھا ہے۔ کاکو کی ڈھلتی جوانی کی طرح اس کے کوٹھے
کو بھی دیمک لگی ہوئی ہے۔ پر اب تو کاکو کی مورنی بھی مستی میں ناچنے لگی ہے اور ماں کی تربیت
کی بدولت آج کل وہ خود اکیلی اڑانیں بھرتی پھرتی ہے۔ اسی لئے اب انھیں کرپو چمار کی
ضرورت نہیں رہی۔ جبھی تو کچھ دیر پہلے ماں بیٹی نے اس بیچارے کو مار مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔
بیڈے کی لنکا کے آس پاس اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اور بھی ہمسائے، ماں جائے ہیں
پر اُن کی شہرت اتنی نہیں کہ پبلسٹی کے اِس دور میں ان کی بات کی جائے۔

بیڈے کی لنکا کی شہرت کستوری کی طرح اُن دِنوں پھیلنی شروع ہوئی جب ملک تقسیم
ہوا۔ سارے علاقے میں ایک آندھی چلی۔ بھارت کی پوِتر دھرتی اور پاکستان کی پاک
سرزمین سے لوگ بھاگنے لگے۔ استاد محلہ بھی خالی ہونے لگا اور خالی مکانوں میں نہ جانے کہاں
کہاں سے اینٹیں اور پتھر جمع ہوتے گئے۔ بیڈے کے سبھی رشتہ دار موت سے ڈرتے اور زندگی
کے لئے پناہ ڈھونڈتے ان قافلوں میں شامل ہو گئے جو ایک نئے سفر کو چل پڑے تھے۔
نئی زندگی کی تلاش میں۔ بیڈے کے ماں باپ، بہن بھائیوں نے اسے ساتھ چلنے کے
لئے بہت زور لگایا، اس کی منتیں کیں، پر بیڈے نے اپنی لنکا چھوڑنے سے صاف انکار
کر دیا۔ اس کا دل بھی کسی سیتا پر آیا ہوا تھا۔ وہ اپنی لنکا میں سیتا کو رانی بنا کر رکھنا چاہتا تھا
لیکن وہ ڈرتا تھا سماج کی کچی پکی دیواروں سے کہ کہیں وہ اِس کے کارن گِر نہ پڑیں۔ کہیں
لال خون، سفید خون، سبز لہو، کیسری لہو اس کی وجہ سے بہہ نہ جائے۔ لیکن اسے یقین تھا
کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور وہ سیتا کے گھر سے لے کر اپنی لنکا تک کے دشوار گزار راستے
کو ہموار بنا لے گا ـــــ پھر اس کا یقین حقیقت بن گیا۔ حالات ٹھیک ہو گئے۔ بے رونق زندگی
میں پھر رونق آ گئی، مگر بیڈے کی لنکا میں سیتا نہ آئی۔ وہ تو اپنے کنت کی باہوں میں سما گئی
تھی۔ اس کا سارا حسن راجہ کی جوانی میں جذب ہو گیا وہ پکے آم کی طرح راجا کی جھولی میں گر پڑی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پکا آم، شہد کی طرح میٹھا۔ راجہ سب کچھ بھول گیا، ایک بیوی اور دو بچوں کو بھی اسے تو تازہ آم چوسنے کو مل گیا تھا۔ وہ سیتا کو بھگا کر لے گیا ــــ نئی دھرتی، نئے لوگوں میں ــــ بیڈے کی لنکا پر بجلی گری۔ دیواریں لرزیں، زمین پھٹنے لگی پر لنکا نہیں گری۔ بیڈا فرعونِ مصر کی طرح غرق نہیں ہوا۔ وہ تو بہت سخت جان نکلا۔ وہ سب کچھ پی گیا، بھنگ اور شراب میں گھول کر۔ اس نے ایک نئی زندگی ڈھونڈ لی۔

لنکا میں ایک نئی رونق آگئی۔ کچھ پرانے دوست، کچھ نئے یار۔ نہ کوئی سجن پوچھن ہار۔ راون کی لنکا میں سونا ہی سونا تھا۔ پر بیڈے کی لنکا میں چرس، گانجا، چنڈو، افیم، بھنگ، شراب ــــ ہر چیز شباب پر تھی۔ میڈو، چھیدو، چھانی، ظفرا، اگا، نورا، بشیرا...... بیڈے کی لنکا کے چاند تارے دن رات.... حال مست، چال مست۔ کرونج، مانگ پتا، چسلا، تاش، پپلو، دانہ، کسمسی کی چوکڑیاں جمتی رہتیں، بھنگ اور شراب کے گلاس خالی ہوتے رہتے۔ گانجا، چرس، چنڈو کے کش، افیم کی گولیاں، لنکا کو مست بنائے رکھتیں۔

"گامی یار! تاجی کی کڑی تو آگ ہے آگ ــــ"

"ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تند ہوا کے تیز جھونکے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیں گے۔"

"چودھری کی بہو آج کل شامے کے ساتھ پھنسی ہے۔"

"اس کبوتری کا کیا ہے۔ تو دانہ ڈال دے، تیری کابک میں آجائے گی۔"

"ــــ چھانی! تم نے بوٹ ڈالا؟"

"قسم ہے رب کی سب سے پہلے۔"

"ایک بوٹ کم ہے بھئی۔ جس نے نہیں ڈالا، وہ ڈال دے۔ ورنہ میں ایک موٹی سی گالی دوں گا۔"

"کون مائی کا لعل ہے جو ہمیں گالی دے۔ چیر کر نہ رکھ دوں۔"

"بھائی ظفرے! پاکستان کہتا ہے کہ ہم افغانستان کی پسلیاں توڑ دیں گے، اور اگر کسی نے بیچ میں کودنے کی کوشش کی تو ہم اس کی بھی ٹانگیں توڑ دیں گے۔" "بھائی صاحب! اب پاکستان پہلے ایسا نہیں رہا۔ اب کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔"

"اوئے رہنے دے یار، رہنے دے۔ کہیں سر منڈواتے ہی اولے نہ پڑیں۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"سنا ہے یار! امریکہ نے چاند کی دھرتی پر قدم جمالئے ہیں۔"

"بالکل بکواس۔ بھلا خدا کی طاقت کے ساتھ کون لڑ سکتا ہے۔"

"لعنت بھیجو یار، ان فضول باتوں پر۔ ان میں کیا رکھا ہے۔ تم لوگ بھنگ گھوٹو۔"

بیڈے کی لنکا کے چاند تارے، باہر کی دنیا کی سبھی باتوں کا گلقند بنا کر کھا جاتے اور بھنگ پیتے رہتے۔ ان چاند تاروں کا ہسٹری شیٹ بنا ہوا تھا اور گلی ڈنڈا کھیلنے والی عمر سے ہی یہ کبھی پولیس کو آگے آگے اور کبھی پیچھے پیچھے چلاتے پھرتے۔ بیڈے کی لنکا میں چنڈو گانجے اور چرس کے بادلوں میں کبھی کبھی گاشاں، جاناں، کاکو، دیشو کے ننگے سائے بھی لہراتے ہوئے دکھائی پڑتے۔ آوازیں ابھرتی رہتیں، پتے چلتے رہتے، دانے گرتے رہتے، نال نکلتی رہتی ـــــ اور سیدھی گولک میں۔ جمع ہو جاتی۔ اور جب گولک اپنا منہ کھولتی تو تھانیدار سے لے کر ایس پی صاحب اور سٹی جج صاحب سبھی خیرات پاتے۔ خیرات بالکل اسلامی ڈھنگ سے دی جاتی۔ کیونکہ مولوی جی نے فرمایا تھا ـــــ "خیرات ایک ہاتھ سے ایسے دو کہ تمہارے دوسرے ہاتھ کو پتہ تک نہ چلے" ـــــ اور جب کبھی اس نظام میں بے ضابطگی ہو جاتی تو لنکا میں ایک زلزلہ آ جاتا۔ چہل پہل ختم ہو جاتی۔ کھیل خراب ہو جاتے۔ بھنگ، شراب، چرس گانجا، افیم ـــــ بیڈا، ظفرا، نورا، بشیرا، گاما ـــــ شرابی، کبابی، افیمی، چرسی ـــــ پولیس تھپڑ، مکے، شور شرابہ، جامہ تلاشی، گولک، ہتھکڑیاں، تھانہ، عدالت، جیل اور بھونچال ختم۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد بیڈے کی حالت کئی کئی روز تک بہت پتلی رہتی۔ اُسے کئی کئی دن فاقے لگتے۔ محلہ کے کئی چودھری ہمدردی جتانے اور لنکا کو کوڑیوں کے بھاؤ خریدنے کے لئے بیڈے کو جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ وہ سب کو ایک ہی جواب دیتا:۔

" بیڈے کی لنکا بک نہیں سکتی۔ بیڈے کی لنکا کھڑی ہے اور کھڑی رہے گی۔ چاہے بھوک ننگ بیڈے کو کھا جائے"

پر بھوک اسے نہ کھا سکی۔ وہ بھوک کو کھا جاتا۔ ایک لمبے عرصہ تک ایسے ہی چلتا رہا۔ لیکن آخر کہاں تک۔ جمہوری دور کی جمہوری حکومتیں، نئے نئے سپنے دکھاتی رہیں جنکی بھیکی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تعبیریں ضرب کے سوالوں کی طرح پھیلتی ہی جاتیں۔ اور میدے، پھیدے، نورے، ظفرے تقسیم کے سوالوں کی طرح سکڑتے ہی جاتے۔ بیڈا بھی دن بدن سکڑتا گیا۔ جوانی بڑھاپے کے آگے ہتھیار ڈال رہی تھی۔ اس کی زندگی کی گاڑی کے گھوڑے اب ڈھیلے پڑنے لگے تھے ــــ جبکہ پولیس کی مشین کے پرزے سخت ہونے لگے تھے۔ اب پولیس کی نظروں میں کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ کھاپی کر بھی وقتاً فوقتاً یلغار کر دیتی۔ تقسیموں کی طرح سکڑتے سمٹتے لوگ اپنے شغل پورے کرنے کے لئے کوئی نئی کچھار ڈھونڈنے لگے۔ لنکا میں آوازوں کا بے سرا سنگیت ختم ہو گیا۔ چنڈو گانجے، چرس کے بادل چھٹنے لگے۔ گاشاں، جاناں، کاکو، ویشو کے سائے مٹتے گئے اور بیڈا اپنے وجود کی کال کوٹھری میں گم ہوتا گیا۔ وہ کبھی کبھی باہر کی دنیا کا بھی چکر لگاتا اور بڑا دکھی ہو جاتا ــــ وہ دیکھتا ــــ محلے کے لگ بھگ آدھے مکانوں پر سرکار نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ دیکھتا ــــ برساتی کیڑوں کی طرح کئی سچے جھوٹے ــــ بھائی، بیٹے، مامے، چاچے، بیٹیاں، بہنیں، ماسیاں، پھوپھیاں مکانوں کے وارث پیدا ہو گئے تھے جو سونے کو مٹی کے بھاؤ بیچتے تھے۔ وہ بے چین ہو جاتا۔ لیکن کچھ نہ کہتا۔ اس کا بھی کئی مکانوں کے ساتھ دودھ اور لہو کا رشتہ تھا۔ مگر اس نے اپنی لنکا کے سوا کسی چیز کی جانب کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بیڈے کی اجڑی حالت دیکھ کر ہنومانوں کی فوج نے لنکا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ نورا، بشیرا، میدو، پھیدو آہستہ آہستہ گھر گرہستی کے بانٹنے کھیلنے لگ پڑے تھے۔ پر بیڈے نے ایسا کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ اس کی لنکا اس کی دنیا تھی اور وہ اپنی دنیا کا بے تاج بادشاہ ــــ جو اب کئی کئی روز لنکا سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔ سینے میں کئی روگ دفن کئے ہوئے، آنکھوں میں ختم نہ ہونے والی آس کا ایک دیا جلائے ــــ وہ کمرے میں ٹوٹی پھوٹی کھٹیا پر پڑا رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دیکھتا رہتا۔ اس کی حالت دیکھ کر محلہ کے چودھریوں نے لنکا میں آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ بیڈے کی خیریت پوچھتے اُسے دوا دارو کے لئے پیسے دینے لگے۔ اس کے لئے دوائی لاتے۔ وہ تماشہ دیکھتا رہتا ــــ اور پھر سب کو ایک ہی جواب دیتا۔

”بیڈے نے خوب بدمعاشی کی ہے۔ جی بھر کے جُوا کھیلا ہے۔ بیڈے کو تاش کے باون پتوں کی اچھی طرح سے شناخت ہے۔ آج کل بیڈا زندگی کا جُوا کھیل رہا ہے اور جیت ضرور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بیڈے کی ہوگی۔

شام کو کبھی کبھار بیڈا اپنی لنکا کی چھت پر بیٹھ کر دور سامنے سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہتا اور سوچتا ــــ "کاش سورج پھر اسی طرف سے چڑھے اور دوڑتا دوڑتا اس کی گود میں آکر بیٹھ جائے۔ لیکن سورج مغرب سے کبھی نہیں ابھرا۔ وہ تو ہمیشہ مشرق سے نکلتا ہے ــــ اور جب کبھی مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے الجھنے لگتے تو بیڈا مایوس ہو جاتا۔ اس کا چہرہ بے رنگ ہو جاتا اور آنکھیں بے نور۔ موت کی سی خاموشی اسے گھیر لیتی۔ وہ جو کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ روز مسجد میں جاتا۔ نماز اسے آتی نہ تھی، پر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا اور نمازیوں کو سجدے کرتے دیکھ کر دل ہی دل میں جانے کتنے سجدے کر ڈالتا۔ پھر وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتا۔ آسمان جو آگ برسا رہا ہوتا۔ آسمان جس نے قیامت مچائی ہوتی۔ اور جب کبھی پورب اور پچھم آپس میں مل بیٹھنے کا فیصلہ کرتے تو بیڈے کے بے رنگ چہرے پر خوشیوں کے کئی رنگ چڑھنے لگتے، آنکھوں میں ختم نہ ہونے والی آس کا نور پھر چمکنے لگا اور موت کی سی خاموشی زندگی کے مدھر سنگیت میں پھر ڈھل جاتی۔

ایک دن باغ کے پاس کاکے کی ریڑھی کے سامنے میں بُھنا ہوا گوشت کھا رہا تھا کہ بیڈا شراب کے نشے میں دھت، میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے گھورتا رہا اور پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا:

"بیٹا! تم بیڈے کو نہیں جانتے۔ تمھاری نانی بیڈے کو جانتی تھی۔ وہ بیڈے کو بہت چاہتی تھی۔ کیوں نہ چاہتی، بیڈا اس کا بیٹا تھا۔ تم لوگ پڑھ لکھ کر بابو بن گئے ہو۔ مگر بیڈا بابو نہیں بنا۔ وہ شرابی، کبابی، جواری، بدمعاش بن گیا۔ بیڈے کا یہاں کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتا تو وہ بھی بابو بنتا۔ بیڈے کا یہاں کوئی بازو نہیں جبھی تو سبھی اسے کچلنا چاہتے ہیں۔"

"بھائی صاحب! بات کیا ہوئی۔ آپ اتنے دکھی کیوں ہیں؟" ــ میں نے پوچھا

"بیٹا! بیڈا دکھی نہیں ہوتا۔ وہ تو دکھوں کو پی جانے کا عادی ہے۔ لیکن محلّے کے ان مومنوں کی کرتوتیں دیکھو۔ جنگ میں لوگوں کا نقصان ہوا، سرکار کی طرف سے انھیں پیسے ملے جن کا نقصان نہیں ہوا تھا۔ ان عزت دار چودھریوں نے مٹھی گرم کر کے انھیں بھی رقم دلا دی۔ بیڈے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی بھی آدھی لنکا ڈھے گئی تھی۔ مگر اس کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ کوئی بات نہیں۔ بیڈا ابھی زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ بیڈا خود اپنی گری ہوئی لنکا پھر کھڑی کرے گا۔"

"مگر بھائی صاحب آپ اپنا مکان فروخت کیوں نہیں کر دیتے۔"

"ہرگز نہیں۔ بیڈے کی لنکا بک نہیں سکتی۔ یہ لنکا امانت ہے۔ بیڈا امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ بیڈے کے بھائی بہنیں، ان کے بیٹے بیٹیاں، اس لنکا کے وارث۔ جب واپس آئیں گے تو کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ بیڈا کتنا کمینہ نکلا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لنکا بیچ دی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بیڈا لنکا کا رکھوالا ہے۔ بیڈا لنکا بیچ نہیں سکتا ——"

"بھائی صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ تو اب یہاں کبھی نہیں آ سکتے "——

"بکواس بند کرو" —— وہ چلایا —— اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا اس کے شریر کا سارا لہو اس کی آنکھوں میں اتر آیا —— اور پھر آنکھوں میں اُترا ہوا لہو.... دھیرے دھیرے اپنی رنگت بدلنے لگا —— اس نے مجھے چھوڑ دیا —— اور چپ چاپ اپنی لنکا کی طرف چل پڑا —— لیکن میری قمیض تار تار —— ہو چکی تھی ——۔

کھوکھلا سورج

میں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ میں پیوند کاری میں ماہر ہوں۔ یہ کہانی بھی میں ٹکڑوں میں ہی بیان کرنے جا رہا ہوں۔ آپ میرا یقین کریں کہ یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی ـــــ ایک کہانی ـــــ کئی ٹکڑے۔ چھوٹے بڑے، غیر ضروری، ضروری ـــــ ٹکڑے ـــــ اور یہ پہلا ٹکڑا ـــــ

ایک نوخیز دوشیزہ ـــــ بھرے بھرے جسم والی۔ سینے پر دو کچی ناشپاتیاں۔ انگ انگ میں گلاب کی مہک۔ اپنے وجود کے جنگل کو ہرا ہوتے دیکھ رہی یہ لڑکی ـــــ ایک دن لہلہاتے کھیتوں میں سبز کھیرے توڑنے گئی ـــــ یہاں ذرا رک جائیں کیونکہ اس پہلے ٹکڑے کا دوسرا حصہ اب یہاں نہیں جڑے گا۔ اس لئے اب کہانی کا دوسرا ٹکڑا پڑھیئے۔

ایک لڑکا جوانی کے خمار میں بدمست۔ چڑیوں کا شکاری ایک شہمار ـــــ لڑکی کو کھیت میں جاتے دیکھ کر اپنے بل سے نکلا اور لڑکی کے سامنے کنڈلی مار کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ بڑبڑایا ـــــ پھر اس نے گردن لمبی کی اور لڑکی کو ڈسنے کے لئے منھ کھولا۔ لڑکی نے منت سماجت کی، شور مچایا۔ زبردست مزاحمت کی۔ لیکن سانپ ڈنک مار گیا۔ چڑیا شکار ہو گئی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لڑکا سبز جنگل کو تباہ کرکے اپنی بڑی حویلی میں چلا گیا۔ اور لڑکی ــــ کہ جس کے سانولے حسن کو دوبالا کرنے والی ناک کی نتھنی اُتر چکی تھی۔ کچی ناشپاتیوں پر جا بجا ناخن اور دانت گڑے ہوئے تھے اور موٹی سرمئی آنکھیں، دھند لاکر پلکوں میں سما گئی تھیں ــــ ہاں! وہ لڑکی ــــ نوچے ہوئے جسم کو سمیٹے، آسمان کا بوجھ اٹھائے ــــ بوجھل قدموں سے روتی بلکتی اپنی جھونپڑی میں چلی آئی ــــ

لڑکی کو اجڑا دیکھ کر ایک کہرام مچا۔ جھونپڑی میں زلزلہ آیا۔ ذہن و دل کو سخت دھکا لگا۔ جھونپڑی کا زلزلہ بستی میں پھیل گیا ــــ بستی درد سے کراہنے لگی۔ پھر درد کے دریا میں طغیانی آگئی۔ بستی والے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے۔ وہ حویلی والے لڑکے کے خلاف زوردار مظاہرہ کرنے لگے۔ انھوں نے تھانہ میں رپورٹ درج کرائی۔ بات اعلیٰ کرسیوں تک پہنچی۔ بستی میں پولیس آئی۔ لڑکی کا بیان لیا گیا۔ پولیس نے اس کی تار تار قمیض، پھٹی انگیا، خون میں رنگی شلوار اپنی تحویل میں لے لی۔ اور لڑکی کا نوچا بدن معائنہ کے لئے بھیج دیا گیا۔ لڑکے کو گرفتار کر لیا گیا ــــ گواہوں کے بیانات لئے گئے۔ شہادتیں مکمل کی گئیں ــــ اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ کے تحت چالان سیشن کورٹ میں پیش کر دیا گیا ــــ

اور یہ کہانی کا تیسرا اور اہم ٹکڑا ــــ فاروق، سیشن کورٹ کا جج ــــ عدالت کی کرسی پر بیٹھا۔ انصاف کا ترازو ہاتھ میں لئے عدل تول رہا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کبھی کم یا زیادہ تول کر اپنے ضمیر کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ اپنے آپ کو عادل سمجھنے والا یہ جج انصاف پروری کے لئے شہر میں خاصا مشہور ہے۔ پانچ وقت کا نمازی، متقی، پرہیزگار، کم گو، حق و صداقت کا مجسمہ ــــ فاروق ــــ چالان کی مسل ہاتھ میں لئے اوراق الٹ پلٹ رہا ہے ــــ فردِ جرم لگائی جاتی ہے۔ عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے بھرا ہے۔ بھونچال سے متاثرہ جھونپڑیوں والے، مسلی کچلی لڑکی، لڑکے کے خاندان والے۔ ان کے دوست احباب، شہر کے معززین، وکلاء، اخباری نامہ نگار، فوٹوگرافر اعلیٰ سوسائٹی کے ترجمان ــــ اور سپاہیوں کی حراست میں اندر داخل ہونے والا لڑکا۔ پریشان حال، اترا چہرہ، جھکی گردن، پشیمانی کی مورت ــــ جج نے مقدمے کی کارروائی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

شروع کرنے کا اعلان کیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وکیل استغاثہ نے بحث کا آغاز کیا اور لڑکے کے جرم کی تفصیل پڑھ کر سنائی۔ اپنے بیان کے ثبوت میں سرکاری وکیل نے عدالت کو لڑکی کا آسیب زدہ جسم دکھایا۔ خون آلودہ شلوار، پھٹی قمیض اور ٹوٹی انگیا، گواہوں کے بیانات اور ڈاکٹری معاینہ کی رپورٹ ــــ عدالت میں پیش کی ــــ اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا

جج نے ملزم کی طرف دیکھ کر بارعب آواز میں کہا۔

"ملزم کھڑا ہو کر اپنا نام، ولدیت، عمر پیشے اور سکونت کے بارے میں عدالت کے سوالوں کا جواب دے"

یہ حکم سن کر ملزم اٹھا۔ پولیس کے دو سپاہیوں نے اُس کو اُس کٹہرے میں کھڑا کیا۔ جو جواب دہی کے لئے بنایا گیا ہوتا ہے۔

"میرا نام آفتاب عالم خاں ولد خان بہادر شان محمد خاں ہے۔ میری عمر چوبیس سال ہے۔ ہم محلہ نوابان میں رہتے ہیں اور تجارت ہمارا پیشہ ہے۔"

جج نے چند منٹ تک مقدمے کی مسل کا معائنہ کیا اور پھر ملزم کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم پر الزام ہے کہ تم نے مریم بی بی دختر فقیر محمد عرف فقیرو ساکن بستی شیخان، عمر ۱۶ سال سے زنا بالجبر کیا ہے۔ وکیل استغاثہ کی طرف سے پیش کردہ گواہان کے بیانات، ڈاکٹری رپورٹ اور جائے واردات سے لئے گئے دیگر ثبوت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے مریم بی بی پر مجرمانہ حملہ کر کے اس کی عصمت لوٹی ہے۔ یہ جرم تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷٦ کے تحت قابل سزا ہے اور اس میں تمھیں دس سال تک قید بامشقت کی سزا ہو سکتی ہے۔ کیا تم اقرار کرتے ہو کہ تم نے یہ گھناؤنا جرم کیا ہے۔؟"

"نہیں! میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

کمرۂ عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ جج میز پر زور سے ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے۔

"خاموش! خاموش!" ــــ لوگ چپ ہو جاتے ہیں ــــ جج پھر مخاطب ہوتا ہے ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔"؟

وکیل صفائی اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور جج سے کہتا ہے :۔

"جناب والا! میرا موکل بے قصور ہے۔ اس پر غلط الزام لگایا گیا ہے۔ ہم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں اور آپ سے انصاف کے طلبگار ہیں۔"

عدالت کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ مقدمہ اگلی پیشی تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس میں استغاثہ کے گواہان پیش ہونگے۔ ان کی شہادتیں لی جائیں گی وکیل صفائی ان پر جرح کرے گا ـــــ اور اگلی پیشی بہت دور ہے۔ تیسرے مہینے کی آٹھویں تاریخ ـــــ اور خان بہادر شان محمد خاں نے اپنے لختِ جگر کی ضمانت کرالی ہے۔ وہ واپس حویلی میں آگیا ہے

اس بیچ، خاں بہادر، بستی کی رنگ برنگی بھیڑ بکریوں میں سے کچھ کالی بھیڑیں خریدنے کی تگ و دو میں لگ گئے ہیں۔ کالی بھیڑوں کے ذریعہ مریم بی بی اور اس کے باپ فقیرو کے گلے میں دھن مالا ڈال کر ان کا منھ بند کرا دیا جائے، کیونکہ خان بہادر کی نظر میں مریم کی حیثیت کسی دیہاتی نوچی یا شہر کے مہندی بازار کی پتریا سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنے فرزند ارجمند کے ہاتھوں اس کی نتھ اترائی کی قیمت پانچ ہزار تک دینے کو تیار ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پانچ ہزار روپے جھونپڑی کا نقشہ بدل دیں گے۔ مریم آسانی سے بیگم بن جائیگی ـــــ لیکن مریم کے باپ نے دھن کی اونچی سیڑھی پر لٹکے خان بہادر کے منھ پر نفرت سے تھوکتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ لڑکیوں کی عزت کا سودا نہیں کیا کرتے ـــــ خان بہادر کی سبھی کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں ـــــ اور ـــــ مقدمہ کی تاریخ آن پہنچی ہے۔

آواز لگتی ہے ـــــ "سرکار بنام آفتاب عالم خاں ـــــ حاضر ہے۔"

دونوں پارٹیاں عدالت میں حاضر ہوتی ہیں ـــــ کمرہ کھچا کھچ بھرا ہے ـــــ سرکاری وکیل پہلے مریم پھر دیگر گواہوں کو پیش کرتا ہے۔ سبھی لگ بھگ وہی بیان جج کے روبرو دیتے ہیں جو وہ تحریری طور پر دے چکے ہیں ـــــ مریم اپنے ساتھ بیتی واردات کو دہراتے ہوئے ـــــ پہلے تو شرماتی ہے، ہچکچاتی ہے پھر رو پڑتی ہے۔ آنسو اور

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جذبات ہم رشتہ ہو جاتے ہیں۔ اندر کا کرب چہرے پر ابھر آتا ہے۔ کانپتی آواز بلند ہوتی ہے:

"جج صاحب! یہ کس بات کا بدلہ لیا اس بدمعاش نے مجھ سے، یہاں کب تک عورت کی عزت لٹتی رہے گی۔"

رُندھے ہوئے گلے سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ یہ مریم کا باپ فقیرو ہے جو جج سے کہہ رہا ہے:-

"میری عزت کی سفید چادر اس لٹیرے نے داغدار کی ہے، جج صاحب! اس چادر کو دھو دیں، میری عزت کو بحال کر دیں۔ ملزم کو سخت سزا دیں۔ ہمارے ساتھ انصاف کریں اللہ آپ کا اقبال بلند رکھے گا" ـــــ کرم دین عرف کرمو اور ہری چند عرف ہریا نے اپنے بیانوں میں کہا ہے کہ انھوں نے چھوٹے خاں صاحب کو اپنی آنکھوں سے کھیت سے نکلتے دیکھا ہے، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پتلون کو گیلی مٹی لگی ہوئی تھی۔ گریبان چاک تھا۔ بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ حویلی کی طرف جا رہا تھا ـــــ مریم نے انہیں روتے بلکتے بتایا تھا کہ حویلی والوں کے لڑکے نے اس کی عزت لوٹی ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اوڑھنی چھلنی تھی ـــــ باقی گواہوں نے بھی پہلے سے لکھوائے گئے بیانات کی توثیق کی۔

وکیل صفائی نے مریم اور استغاثہ کے گواہان سے جرح کرتے ہوئے بہت سے سوالات کئے:

"مریم بی بی! کیا تم وثوق سے کہہ رہی ہو کہ تم سے منھ کالا کرنے والا یہی شخص تھا، جو کٹہرے میں کھڑا ہے اور جس کا نام آفتاب عالم خان ہے۔ یا وہ کوئی اور تھا؟"

"جی! یہی کمینہ تھا۔ اسی کتے نے میرے جسم کو نوچا اور میری عزت لوٹی۔"

"کیا اس وقت وہاں کوئی اور بھی تھا یا تم دونوں اکیلے تھے؟"

"جی میں اکیلی کھیت میں گئی تھی کہ یہ کلموا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس وقت وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ میں بہت چلائی، روئی، پیٹی، لیکن میری آواز کسی نے نہیں سنی۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقع کی شہادت کوئی نہیں ہے۔ پھر تم کس طرح ثابت کر سکتی ہو کہ آفتاب عالم نے ہی تمھاری عصمت دری کی ہے؟" ـــــ سرکاری وکیل بیچ میں بول پڑتا ہے "میرا فاضل دوست مستغیثہ کو غیر ضروری سوالوں میں الجھا رہا ہے۔ جج صاحب! کوئی بھی لڑکی، خواہ وہ کنواری ہو یا بیاہی، جان بوجھ کر بدنامی کا کلنک اپنے ماتھے پر نہیں لگا سکتی کیا مریم کا نوچا ہوا بدن، ڈاکٹری رپورٹ اور ملزم کا گناہ آلود چہرہ ثبوت کے لئے کافی نہیں"۔ وکیل صفائی نے گواہوں سے بھی کئی الٹے سیدھے سوالات پوچھے۔ لیکن سبھی اپنے اپنے بیانوں پر اڑے رہے ـــــ بعد ازاں صفائی کے وکیل نے اپنے گواہوں کو عدالت میں پیش کیا، جن کا کہنا تھا کہ واردات کے روز چھوٹے خان صاحب پورا دن فیکٹری میں تھے۔ سرکاری وکیل نے اپنی جرح میں ملزم کے گواہوں کا پول کھول کر رکھ دیا ـــــ اور عدالت کا وقت ختم ہو گیا ـــــ گواہوں کے بیانات مکمل ہو چکے تھے، لہٰذا مقدمہ کے فیصلے کی تاریخ چار روز بعد مقرر کی گئی۔

مسجدوں، خانقاہوں، مندروں، گوردواروں اور کلیساؤں کے گنبد اور میناروں والا یہ شہر حبس میں بستی شیخان کی جھونپڑیاں بھی ہیں۔ خان بہادروں اور رائے بہادروں کی حویلیاں بھی ہیں ـــــ اور ایک پہاڑی کے دامن میں شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑا جج فاروق کا بنگلہ بھی ہے ـــــ بنگلہ کے لان میں کرسی پر بیٹھا جج ـــــ مریم کے مقدمہ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جج کو یقین ہے کہ آفتاب عالم مجرم ہے۔ اس نے معصوم مریم کی عزت لوٹی ہے۔ جج نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ حسبِ معمول عدالت کا وقار بلند رکھے گا اور ملزم آفتاب عالم کو عبرتناک سزا دے گا ـــــ باہر گھنٹی بجتی ہے۔ نوکر دروازہ کھولتا ہے۔ اندر آنے والے ڈرائنگ روم میں بٹھائے جاتے ہیں۔ نوکر لان میں جج فاروق کو مطلع کرتا ہے کہ اس سے تین افراد ملنے کے لئے آئے ہیں۔ جج اٹھتا ہے اور ڈرائنگ روم میں آتا ہے ـــــ ملزم کا باپ خان بہادر شان محمد خان، سٹی زن کونسل کے چیرمین اور قانون ساز اسمبلی کے معزز رکن رائے بہادر دولت رام اور مشہور سوشل ورکر کامریڈ اجیت سنگھ جج سے اٹھ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ فاروق اُن کے آنے کا سبب جانتا ہے، پھر بھی پوچھتا ہے، "فرمائیے! آپ نے کیسے زحمت گوارہ کی ہے؟" ـــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جواب میں رائے بہادر دولت رام اور کامریڈ اجیت سنگھ خان بہادر کے لڑکے کی سفارش کرتے ہیں اور اسے باعزت بری کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ خان بہادر کی عزت کا سوال ہے۔ ان کے پُرکھوں کی عزت کا سوال، جس کے خاک میں ملنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

"اس میں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پورا انصاف کروں گا"—— رائے بہادر جج کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بے سود۔ کامریڈ سنگھ جج کو دھمکی دیتا ہے لیکن بیکار۔ جج انھیں چلے جانے کے لئے کہہ دیتا ہے —— بات اعلیٰ کرسیوں تک پہونچتی ہے۔ جج پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ لیڈر، وزیر، افسر سفارش کرتے ہیں، غنڈے بدمعاش دھمکیاں دیتے ہیں —— ٹیلیفون کی گھنٹیوں کا شور بڑھنے لگتا ہے —— آوازیں، سیلاب کی لہروں کی طرح حملہ آور ہوتی ہیں۔

جج الجھنوں کے جال سے باہر نکلنے کے لئے نماز پڑھتا ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے لیکن بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ روح پر چھائے ہوئے گھنے بادل پگھلنے کا نام نہیں لیتے۔ اور من کی ندی میں بہت شور ہے۔

آج مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ وکیل استغاثہ نے خوش اسلوبی سے کیس پیش کیا ہے۔ دلائل مضبوط ہیں اور پھر جج فاروق کی انصاف پروری —— اسے یقین ہے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اور ملزم آفتاب عالم کو سزا ہو جائے گی۔ سرکاری وکیل نے مریم، فقیرو، کرمو اور بستی والوں کو یقین دلایا ہے کہ آفتاب عالم کو سخت سزا ملے گی۔ کیونکہ سارا کیس اس کے خلاف ہو گیا ہے —— کمرۂ عدالت میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں ہے، کمرے میں شور مچا ہے —— لیکن جج کے اندر داخل ہوتے اور عدل کی کرسی پر بیٹھتے ہی شور یکبارگی تھم جاتا ہے —— جج مقدمہ کا فیصلہ سنانے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں میز پر پڑے کاغذ پر جھک جاتی ہیں ——

"ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ مریم بی بی دختر فقیر محمد عرف فقیرو کی عزت لوٹی گئی ہے۔ مریم اور دیگر گواہوں کے بیانات کے مطابق یہ بھی سچ ہے کہ مریم کی عزت کھیت میں لوٹی گئی ہے۔ لیکن استغاثہ یہ ثابت نہیں کرسکا کہ مریم سے زنا بالجبر آفتاب عالم نے کیا ہے۔ کیونکہ موقع واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔ لہٰذا عدالت ملزم آفتاب عالم کو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

باعزت بری کرتی ہے۔"

فیصلہ سنانے کے بعد جج اپنی جھکی نظروں کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر کرسی سے اٹھنے لگتا ہے

قارئین! ذرا رُکئے —— یہاں کہانی ختم نہیں ہوتی، بلکہ یہاں سے کہانی کا ایک اور ٹکڑا شروع ہوتا ہے جو کہانی کو کلائمیکس پرلے جاتا ہے اور کہانی میں جان پیدا کرتا ہے۔

ایک آواز کمرۂ عدالت میں گونجتی ہے اور بکھر جاتی ہے ——

"ٹھہرئیے جج صاحب —— ٹھہرئیے جج صاحب —— ٹھہرئیے جج صاحب ——"

سبھی سکتہ میں آجاتے ہیں —— پھر مریم کے آسیب زدہ جسم کی پسلی سے ایک ننھے سائے کا جنم ہوتا ہے۔ جو دیکھتے دیکھتے پھیل کر قد آور عورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں جج فاروق کے چہرے پر اٹک جاتی ہیں۔ زبان تیز اور نوکیلے دانتوں میں جکڑی جاتی ہے —— لیکن ہونٹ سلگتی آگ کا دھواں چھوڑتے ہیں اور دھواں آواز کا بھروپ لئے ہوئے ہے۔

"ٹھہرئیے جج صاحب! آپ کا نام فاروق ہے اور میرا —— جج صاحب مجھے پہچانئیے میرا نام صرف مریم نہیں ہے۔ سیتا ہے۔ دروپدی ہے۔ ہر یگ میں میری عزت پر حملہ ہوا ہے۔ مجھے رسوا کیا گیا ہے۔ مگر تب انصاف کا ترازو کم اور زیادہ نہیں تولتا تھا۔ تب عدل۔ بکرماجیت تھا —— نوشیرواں تھا —— عمر فاروق تھا —— لیکن آج انصاف کے ترازو میں زنگ لگ چکا ہے۔ آج وہ سبھی چہرے مسخ ہو چکے ہیں —— اتہاس نے کئی کروٹیں بدلی ہیں —— اور نیا یگ شروع ہوا ہے —— پر مجھے وہ خوبصورت اور باوقار چہرے ابھی تک یاد ہیں۔ ان میں سے صرف ایک چہرے کا عکس آپکو دکھا رہی ہوں —— یہ بیتے کل کی بات ہے فاروقِ اعظم، عدل کی کرسی پر بیٹھا ایک جج —— اور میں تب مریم نہیں تھی، سیتا بھی نہیں، دروپدی بھی نہیں بلکہ ایک یہودی لڑکی تھی —— ان دنوں بھی میری عزت لوٹی گئی تھی۔ مجھ سے زنا بالجبر کیا گیا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو —— میرے ہرے جنگل کو تباہ کیا گیا تھا —— اور تباہ کرنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ حضرت عمر کا اپنا خون تھا ان کا بیٹا —— ابوشحمہ، —— میرے پاس تب بھی کوئی ثبوت نہیں تھا، موقع واردات کا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ لیکن میرا بیان تھا۔ ایک عورت کا بیان ــــ جو کبھی خود کو رسوائی کی اندھی کھائیوں میں غرق نہیں کرسکتی ــــ اور فاروق اعظم نے میرے بیان کی تصدیق کرکے جو تاریخی فیصلہ سنایا تھا، وہ انسانی زندگی کے لئے مشعلِ راہ بننا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس ــــ وہ فیصلہ تاریخ کی کتابوں میں دفن کردیا گیا ــــ انھوں نے اپنے بیٹے کو ــــ نہیں نہیں! ــــ ایک مجرم کو سو کوڑوں کی سزا دی تھی۔ مجرم ابھی ساٹھ کوڑے بھی نہ کھا پایا تھا کہ مرگیا۔ حکم ہوا کہ باقی کوڑے مجرم کی قبر پر لگائے جائیں۔

سلگتے دھویں کی پُراسرار آواز سے کمرۂ عدالت میں ایک گہرا شگاف پڑگیا اور مریم کی پسلی سے جنم لینے والا سایہ مریم کو ساتھ لے کر اس میں سما گیا ــــ اور جج فاروق۔ ایک مفلس، قلاش، سب کچھ لٹا کے کرسی سے اٹھا اور رنگین میناروں والے شہر میں گم ہوگیا۔

قارئین! آپ خاموش کیوں ہوگئے۔ بتائیے نا ــــ ان ٹکڑوں کی پیوندکاری سے کہانی بنتی ہے ــــ یا نہیں؟

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دیواروں میں چھپی واسنا

ہر شخص دیواروں کا محتاج ہے۔ دیواریں ـــــ تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لئے ـــــ کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اڑان بھرنے کے لئے۔ دیواریں، مقصد پورا ہونے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لئے ـــــ اور دیواریں ـــــ بہار رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لئے ـــــ دیواریں ـــــ شبنم کے قطروں کے بچاؤ کے لئے جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتے ہیں ـــــ اگر بہار رُت کو دیوار کا سہارا نہ ملے تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو آج اس عورت کا ہے جس کے بے حس جسم کو کوّوں نے بری طرح نوچ ڈالا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے کوّوں کو اپنے جسم سے اڑایا ہے۔ لیکن کوّے پھر کوّے ہیں۔ وہ لاوارث جسم کو دیکھ کر چیلوں اور گِدھوں کو بھی دعوتِ طعام دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت بھی ایک دیوار کی محتاج ہے۔ بہت زیادہ محتاج ـــــ فطرت یزداں کی طرف سے انسان کے لئے بخشش ہے ـــــ اسی لئے فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ گوشت کو نوچنا ـــــ کوّوں کی فطرت ہے اور دیوار کی خواہش کرنا ہر عورت کی فطرت ـــــ اماں حوّا کے سفر سے لے کر اس عورت کے سفر تک اس فطرت کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کرم فرمائی کی کئی کڑیاں ہیں ـــــ ان کڑیوں میں الجھ کر وہ عورت بھی مرادوں کی منزل سے کوسوں دور رہی ہے۔ پنچ تنتر میں ہے:

" ایک خونخوار شیر بوڑھا ہونے پر گلے میں مالا ڈال کر پرہیزگار بن گیا اور جنگل کے ایک کونے میں بیٹھ کر پرماتما کی عبادت کرنے لگا۔ جب کوئی اکیلا دُکیلا جانور شیر کے نیاز حاصل کرنے آتا تو وہ اسے ایک ہی جھپٹے میں ہلاک کر کے اپنا نوالہ بنا ڈالتا۔ ایک دفعہ ایک بلّی نے شیر کے ڈھونگ کا ہر پردہ فاش کر دیا۔ وہ گھومتی گھامتی اُدھر سے گزری کہ اچانک اسے ایک کنویں سے ہڈیوں کی بو آئی۔ اس نے جب کنویں میں جھانکا تو اسے شیر کی کرتوت کا پتہ چل گیا۔"

یہ قصہ تو بہت پرانا ہے لیکن الفاظ تر و تازہ ہیں۔ ان میں صدیوں پرانے لباس کی باس نہیں ہے۔ پرہیزگاری کی آڑ میں بوڑھے شیر آج بھی شکار کھیلتے ہیں۔ اور وہ عمر رسیدہ فنکار جس نے اس عورت کو سب سے پہلے شکار بنانے کے لئے اپنے فنکارانہ ترکش سے منقش تیر پھینکا تو وہ سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

" تم بہت خوبصورت ہو۔ ہونہار ہو۔ قابل ہو۔ ہر موضوع پر کھل کر بات کر سکتی ہو۔ تمھارا مطالعہ وسیع ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں اس چیز کی بہت کمی ہے۔ خاص کر لڑکیوں میں بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی موجودہ نسل صحیح ڈھنگ سے گفتگو نہیں کر سکتی۔ کسی بھی موضوع پر بات کریں آپ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کورا ہی پائیں گے ـــــ ایسے ماحول میں تم جیسی لڑکی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ تمھاری قابلیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج اعلیٰ سرکاری عہدہ پر براجمان ہو۔"

" جی شکریہ!" دراصل اس میں ماحول کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد ـــ ملک کے مشہور وکیل تھے۔ انھیں ادب، فلسفہ اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا ـــ میں بچپن سے ہی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی پڑھ لیا کرتی تھی جو میرے والد پڑھنے کے لئے لاتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں دو ہزار سے زائد کتابیں ہیں ـــ میرے بھائی ایک مشہور انجنیئر ہیں۔ ملک کی دشوار گزار سڑکیں انہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک ماہر آرٹیٹیکٹ ہیں۔ ہمارے شہر کی فلک بوس عمارتوں میں سے کم از کم ایک چوتھائی کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نقشے انھوں نے بنائے ہیں ـــــ مجھے تاریخ اور فلسفے سے بے حد دلچسپی ہے۔"

وہ باتیں کر رہی ہے ـــــ بوڑھے فنکار کی ماہر نظریں اس کے جسم کے ایک ایک زاویے کو ٹٹول رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی بھوک، تڑپ، آرزو ـــــ پلکوں پہ آجاتی ہے اور کبھی کبھی پلکوں سے باہر بھی جھانک لیتی ہے۔

"اس سرکاری عہدے پر میں میرٹ کی وجہ سے آئی ہوں۔ میں نے کمپٹیشن میں حصہ لیا اور ٹاپ کیا ـــــ باقی آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ ہاں! آپ کے بیٹے کا کیس منظوری کے لئے بھیجا ہے۔ ہم نے سفارش کر دی ہے کہ آپ کا بیٹا آنتوں کا ماہر ڈاکٹر ہے اور مزید تعلیم کے لئے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کی خواہش کو دبانا نہیں چاہئیے۔ بلکہ اسے جانے کی اجازت دے دینی چاہیئے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ اپنے دیش واسیوں کی بہتر سیوا کر سکے۔"

"مس نازیہ! اس سے ملو یہ میرا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر سندال حیدر۔ کل اس کا جنم دن ہے ہم تمھیں انوائٹ کرنے آئے ہیں۔ کل رات تم ڈنر ہمارے ہاں ہی لو گی۔ میں نے اپنے گھر کا ایڈریس تو تمھیں بتا ہی دیا ہے۔"

"لیکن ـــــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے سے تمھارا کئی بار ذکر کیا ہے۔ یہ بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ بھی ساتھ چلا آیا ـــــ اسی طرح تعلقات بڑھتے ہیں ـــــ ہاں! تم اپنے بڑے بھائی انجنیئر صاحب کو بھی ساتھ لیتی آنا۔"

تعلقات بڑھتے گئے۔ آخر ایک دن بوڑھے فنکار کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا۔

"مس نازیہ! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ کے لئے ہمارے قریب آجاؤ۔ میرا بیٹا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ تمھیں بہت پسند کرتا ہے۔ دل و جان سے چاہتا ہے۔ میری پسند بھی صرف تم ہی ہو ـــــ تم اس سے کئی بار مل چکی ہو۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ امریکہ جانے سے قبل ہی شادی کرے ـــــ تمھاری کیا مرضی ہے۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس معاملہ میں آپ میرے بھیّا سے بات کریں۔"

مس نازیہ ـــــ مسز نازیہ سندال حیدر بن گئی ـــــ بوڑھا فنکار بے حد خوش ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اس میں نئی جوانی آگئی ہے۔ اس کے اندر جذب ہو چکی شوخیوں کو پَر لگ گئے ہیں اور پر، من پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ وہ ہر رات کو نازیہ اور حیدر کے بیڈ روم میں جھانکتا رہتا ہے۔ ان سوراخوں سے جو دکھائی نہیں دیتے ـــــ نازیہ اور حیدر اس کے لئے تسکین کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نازیہ کے جسم کے زاویوں کا افسانہ پڑھتا رہتا ہے اور پھر اپنے بدن کا منوں بوجھ لے کر بیڈ روم میں آجاتا ہے اور اپنے بستر کے پھیکے سفر پر گامزن ہو کر کروٹیں بدلتا رہتا ہے ـــــ اب ہر روز اس کے تن کے صحرا میں بگولے اٹھتے ہیں، جنھیں ہر رات وہ راکھ میں ٹھنڈا کرتا ہے۔

پھر ڈاکٹر ہندال حیدر مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا اور نازیہ اپنے دفتر کے بعد گھر میں بوڑھے فنکار کے ساتھ رہنے لگی ـــــ اور پھر ایک رات ـــــ نازیہ کے تپتے بیساکھ کو بوڑھا فنکار اپنے واسنا سے بھرے بن باس میں اٹھا کر لے گیا ـــــ وہ اپنے ہاتھوں میں، اپنی باہوں میں چاند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر چاند اس کی انگلیوں سے پھسل جاتا۔ بار بار کی پھسلن سے چاند نیچے گر گیا اور بوڑھے فنکار کی مٹھی میں آگیا وہ بولا۔ "وہ مکان جس کی چھت پر برف پڑی ہو، اس کے اندر بھی آگ جلتی ہے۔"

بستر کے پھیکے سفر کی یاترا سپھل ہوئی۔ ـــــ الاؤ روشن ہوا اور پھر اندھے کنوئیں میں جا کر بجھ گیا ـــــ نازیہ کے سُلگتے جسم کو آنکھوں کا ساون رِم جھم سے ٹھنڈا کرنے لگا۔ اور پھر اس نے بوڑھے فنکار کے مہذب ڈرائنگ روم سے نکل کر بار روم تک جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ پھر بھی وہ سُلگتی رہی۔ ابلتی رہی اور بکھرتی رہی ـــــ بوڑھا فنکار کسی اور تصویر کو مکمل کرنے میں مگن ہو گیا اور نازیہ جلتی تنہائی کو آتے جاتے موسموں میں گم کرنے لگی ـــــ لیکن سورج، چاند، ستارے پی جانے کے بعد بھی وہ پیاسی رہی ـــــ بوڑھے فنکار نے اُسے بدچلنی کے گھوڑے پر سوار کر کے اپنے گھر سے روانہ کر دیا ـــــ نازیہ روایت سے نہیں ٹکرائی۔ اس نے سماج کی فضول رسموں کو بالائے طاق رکھ کر سلگتی ویرانی کو اپنا نشیمن بنا لیا ـــــ اور پھر۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اس کے نشیمن پر آئے دن بگولے حملے کرتے رہے۔ وہ ہر حملہ سہتی رہی ـــ دُکھ ایک پل کا بھی ہو تو عمروں لمبا ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ طویل ہو، تب رگوں میں پھیلنے لگتا ہے ـــ رگوں میں پھیلے درد کے دریا کی لہروں کو شانت کرنے کے لئے وہ ایک دیوار کا سہارا ڈھونڈنے لگی تاکہ وہ قلعہ بند ہو جائے اور ہزار ہا سروں والے اور بیشمار ہتھیاروں سے لیس آسیب پل پل اس کا پیچھا نہ کرسکیں۔ لیکن اسے ہر بار ـــ کچی دیواروں سے ہی واسطہ پڑتا جو مقصد پورا ہونے کے بعد ہی گر جاتیں ـــ اور ـــ اس کے نشیمن کے صحن میں پھر سے رستے بننے لگتے ـــ ایک پائیدار دیوار کی خواہش میں وہ آج بھی بھٹک رہی ہے، تن کا صحرا لئے ـــ اور اس صحرا کے لئے دکھائی دینے والا ہر نخلستان ایک سراب ہے ـــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پانی کی لکیریں

سرحدی حفاظتی پولیس کے حولدار کرنیل سنگھ نے اپنے چوکی افسر انسپکٹر رندھاوا کو سلوٹ مارا اور کہا :-

"صاحب! دو پاکستانی جاسوس سرحد پار کرتے پکڑے گئے ہیں۔ واپس پاکستان جا رہے تھے کہ ہمارے نوجوانوں نے پکڑ لیا۔"

"جامہ تلاشی لی ؟" انسپکٹر نے وردی پہنتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ! ایک کی جیب سے دو روپیہ والا پاکستانی نوٹ اور دوسرے کی جیب سے ہماری کرنسی کے ایک ایک روپیہ والے چار نوٹ ملے۔ اور کچھ نہیں ملا صاحب!"

"اور کچھ نہیں ملا... ؟" انسپکٹر نے بڑی حیرانگی سے پوچھا۔

"نہیں صاحب! لیکن ایک کی جیب سے مونگ پھلی کے دانے اور دوسرے سے ریوڑیاں ملی تھیں۔ دونوں مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھاتے ہوئے اور فلم "بوبی" کا گیت.... "ہم تم ایک کمرے میں بند ہو جائیں اور بوبی آجائے"۔ گاتے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گاتے سرحد پار کر رہے تھے کہ رنجیتے، کرشنے اور ڈیوڑ نے دونوں کو جا پکڑا۔ بہت پھڑپھڑائے..... لیکن ہم نے پھڑکنے نہیں دیا۔ کہتے ہیں کہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ بھلا..... یہاں بیساکھی کے میلے میں اُن کی اماں ناچ رہی تھی۔ جس سے ملنے آگئے۔ مُسلے..... کہیں کے۔،،

”چلو بھئی کرنیل سنگھ! دکھاؤ تو بھلا، کون سے جاسوس پکڑے ہیں آپ لوگوں نے“ اس نے اپنے خیمے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور دونوں چوکی کی جانب چل پڑے۔

وہ ستووالی، کی اس چوکی پر انسپکٹر رندھاوا کو آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہونگے۔ ملک کے لئے اپنی جان قربان کرنے کے جذبے نے اسے تعلیم مکمل نہیں کرنے دی۔ اُسے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت لڑائی میں امرجنسی کمیشن مل گیا۔ اور پھر اُسے جنگ کے کسی اگلے مورچے پر بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کے جذبے کی گرمی نے اس کی بڑی مدد کی۔ اور اُس نے دلیری کے کئی کارنامے انجام دیئے۔ جنگ ختم ہوتے ہی رندھاوا کو بھی دوسرے عارضی بھرتی کیئے گئے فوجیوں کی طرح فوج سے نکال دیا گیا۔ لیکن اس کے ویر چکر نے اسے کئی چکر کرانے کے بعد بارڈر سیکورٹی فورس میں انسپکٹر بنا دیا۔ ان چکروں نے رندھاوا کے سارے جذبات ٹھنڈے کر دیئے تھے۔ اور اب اسے اچھے بُرے کی پہچان ہوگئی تھی۔ اس نے بھارت ماتا کے اصل دشمن اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

—— اس نے دونوں جاسوسوں کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ بارہ۔ بارہ۔ تیرہ تیرہ سال کے کمسن لڑکے، گورے چِٹّے چہرے، چانٹے پڑنے سے اور بھی سرخ ہو گئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئیں، چہرے پر انگلیوں کے نشان۔ دونوں سہمے ہوئے ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیوں بھئی لڑکو! تم کہاں سے آئے ہو“؟ انسپکٹر رندھاوا نے رُعب سے پوچھا۔

”ہم جناب کجلیاں سے آئے ہیں“

”کجلیاں تو پاکستان میں ہے، تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟“

”پتنگ لُوٹنے!“

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"پتنگ لوٹنے؟"

"جی ہاں!"

"تو لوٹی پھر تم نے پتنگ؟" انسپکٹر رندھاوا نے جرح کی۔

"نہیں جی!"

"کیوں؟"

"پتنگ ہمارے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ آم کے پیڑ کی ٹہنی سے جا اٹکی۔"

"پھر تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے۔ یہاں کیا کرتے رہے؟"

صاحب! یہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں۔ بکواس کر رہے ہیں۔ انھوں نے پہلے یہ بیان دیا کہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ صاحب یہ پکّے جاسوس ہیں۔ ایسے کئی لڑکوں کو دشمن نے جاسوسی کی تربیت دے کر ہمارے ملک میں بھیجا ہے۔ تاکہ ہم پر ایک اور حملہ کی تیاری کی جاسکے۔ یہ دشمن کی نئی چال ہے۔" حوالدار کرنیل سنگھ نے انسپکٹر رندھاوا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میرا نام محمّد طفیل ہے۔" نکر پہنے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔

"میرا پورا نام عبدالعزیز باجوا ہے۔ لیکن مجھے سبھی جیجی کہتے ہیں۔ پتلون پہنے ہوئے نے جواب دیا۔

"تم دونوں کی عمر کیا ہے؟"

"میری عمر تیرہ سال ہے۔" طفیل نے جواب دیا۔

"ماں کہتی ہیں کہ میں نے چودھویں سال میں پاؤں رکھا ہے عزیز نے کہا۔

"تم آپس میں کیا لگتے ہو؟"

"جی! ہم دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔"

"رہتے کہاں ہو اور کیا کام کرتے ہو؟"

"میں گورنمنٹ ہائی سکول ڈالووالی میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔" اور ہم رہتے بھی وہیں ہیں۔" طفیل نے جواب دیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں بھی ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ اور اُس سامنے والے گاؤں کجلیاں میں رہتا ہوں۔ آج کل ہماری چھٹیاں ہیں۔ اِسی لئے طفیل ہمیں ملنے آیا ہوا تھا۔"

"اچھا تو اب سچ سچ بتاؤ کہ تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟ دیکھو! اگر تم لوگوں نے سچ بتایا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ورنہ تمہاری چمڑی اُدھیڑ کر اس میں بھوسہ بھر دیں گے اور تمہارا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلا دیں گے۔ سچ بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے۔ تمہارے سپرد کیا کام کیا گیا تھا؟ یہاں تم کن کے پاس رہے ہو؟ تمہارے کتنے آدمی یہاں کام کر رہے ہیں؟" انسپکٹر رندھاوا نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔ اس کی آنکھیں دونوں لڑکوں کے چہروں پر مرکوز تھیں۔۔۔ سپاٹ چہرے وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور کبھی انسپکٹر کی طرف۔

"جناب! ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں"۔ جیجی نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا پاک کی قسم! ہم یہاں پتنگ لوٹنے ہی آئے تھے۔ بات یوں ہوئی کہ ہم دونوں چھت پر پتنگ اُڑا رہے تھے۔ ایک کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتے ہی میں نے اپنی پتنگ کی ڈور چھوٹے بھائی شریف کو دی اور خود پتنگ لوٹنے دوڑ پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے طفیل بھی دوڑا اور ہم دونوں "بوکاٹے" کہتے کہتے آپ کے گاؤں تک پہونچ گئے۔ دور ہی کتنا ہے۔ بس گنتی کے یہ دو چار کھیت ہی تو پھلانگنے پڑتے ہیں"۔ جیجی نے ہاتھ سے ناپتے ہوئے کہا۔

"جب تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ ہمارا گاؤں ہے تو تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے؟" حوالدار کرنیل سنگھ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اس کی خوفناک صورت دیکھتے ہی طفیل بول پڑا۔

"نہیں جی! یہ سامنے کے گاؤں سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی تھی۔ ڈھول کی آواز سُنکر ہم سے رہا نہیں گیا۔ ہم دونوں تماشہ دیکھنے وہاں چلے گئے۔ وہاں جناب! ایک ڈھولیا، ڈھول بجا رہا تھا۔ اور لوگ بھنگڑہ ناچ رہے تھے۔ بہت ہی شور و غل تھا۔ کچھ لوگ دارو پی کر آوازیں کس رہے تھے۔ ڈھول کی تال پر ہم دونوں بھی ناچ پڑے۔ ایک بوڑھا ناچتے ناچتے میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور پھر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہم سبھی ناچتے گاتے، نواں شہر پہونچے۔ میں اور جیجی بھی۔ وہاں جب وہ ایک بس پر سوار ہونے لگے تو ہمیں پتہ چلا کہ وہ جموّں جا رہے تھے۔ نہر پر بیساکھی کا میلہ دیکھنے۔ جیجی نے بھی مجھے میلہ دیکھنے کے لئے کہا۔

"جناب یہ تو مانتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ ہم شام تک واپس لوٹ آئیں گے تب اس نے بھی حامی بھری،" عزیز نے طفیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرے ابا اکثر کہا کرتے ہیں کہ جموّں .... نہر پر بیساکھی کا ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اور وہ دو آنے کرایہ خرچ کر کے ایک گھنٹے میں نہر پہونچ جایا کرتے تھے۔ سارا دن میلہ کی رونق دیکھ کر شام کو واپس گھر لوٹ آتے ــــ ہم بھی ایک بس میں بیٹھ گئے ــــ اور جناب! ہم نے وہاں بیساکھی کا میلہ دیکھا۔ جی بھر کے بھنگڑہ ڈالا۔ گنّے چوسے قلفی کھائی، میلہ دیکھنے کے بعد ہم نے ایک فِلم بھی دیکھی۔"

"ہاں جی! جھوٹ بولے کوّا کاٹے، کالے کوے سے ڈریو۔" طفیل جھٹ سے بیچ میں بول پڑا۔

"چپ کرو طفیلؔ! یہ مونچھوں والا "ظ" ظالم پھر مارے گا۔" عزیز نے طفیل کے چٹکی بھرتے ہوئے کانا پھوسی کی۔ اردو قاعدہ میں "ظ" کے خانے میں ہے نا بالکل اسی سردار کی تصویر۔

"ہاں ہاں! بالکل اسی کی تصویر ہے۔ جبھی تو اس ظالم نے ہمیں مارا۔" طفیل نے کرنیل سنگھ کو دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

"لیکن جموّں جانے کے لئے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟" انسپکٹر رندھاوا نے تفتیش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جیجی کے پاس تو کوئی پیسہ نہیں تھا۔ پر میرے پاس دو روپے کا اپنا ایک نوٹ تھا۔" نواں شہر، پہونچ کر میں جموّں کی ٹکٹ لینے کے لئے وہ نوٹ ٹکٹ کلرک کو دینے ہی لگا تھا کہ جیجی نے روک دیا اور کہا کہ یہاں پاکستانی نوٹ نہیں چلتے۔ میرے ابا نے حج سے میرے لئے ایک گھڑی لائی تھی۔ ہم نے وہ گھڑی وہاں، ایک گھڑی ساز کو تیس ۳۰

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

روپے میں فروخت کی تب کہیں جاکر ہم جموّں پہونچے۔ ہم نے وہاں میلہ دیکھا فلم دیکھی اور پھر بس میں ہی بیٹھ کر واپس نواں شہر، پہونچ گئے اور اسی راستہ سے واپس اپنے گاؤں کو جارہے تھے۔ کہ ان ظالموں نے ہمیں پکڑ لیا اور بہت پیٹا!!
طفیل نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور رونے لگا۔
"انہوں نے ہمیں چھوٹا دیکھ کر مارا ہے۔ اگر میرے ابا کو پتہ چل جائے تو وہ ان کے ٹکڑے کر دے۔ بڑے پہلوان بنے پھرتے ہیں" عزیز نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔" تیرے ابّے کو کھائیں سؤر۔ حرامی۔ اُبّے کا رعب دکھاتے ہو۔ تیرے ابا کی ماں کی...... صاحب! یہ کتّے جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بالکل یقین نہ کریں۔ گورو مہاراج نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مُسلا، تیل والا بازو تلوں کی بوری میں ڈال دے اور پھر اتنی ہی قسمیں کھائے کہ جتنے تل اس کے بازو پر لگے ہوں۔ تب بھی اس کی بات کا یقین نہ کرو۔ صاحب! یہ پکّے جاسوس ہیں۔ انہیں ہیڈ کوارٹر بھیجنا چاہیئے — خود انٹروگیشن سینٹر والے سب کچھ اگلوالیں گے"۔ حوالدار کرنیل سنگھ انسپکٹر رندھاوا کو مشورہ دے رہا تھا۔
انسپکٹر نے دونوں لڑکوں کو چپ کرایا اور کرنیل سنگھ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
"کس گورو صاحب نے، یہ تلوں والی بات کہی تھی۔؟"
"یہ تو میں نہیں جانتا صاحب۔ پر یہ بات ہے بالکل سچ۔ ہمیں گرنتھی جی نے بتائی تھی۔ اور وہ کوئی جھوٹ تھوڑی بولیں گے"۔
ایسی غلط باتیں پھیلاتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آنی چاہیئے"۔ انسپکٹر رندھاوا نے کرنیل سنگھ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اور جیپ منگوانے کا حکم دیا۔ وہ یہ کیس ہیڈ کوارٹر بھیجنے سے پہلے اپنا اطمینان کرلینا چاہتا تھا۔
— جیپ، نواں شہر کی طرف دوڑ رہی تھی اور...... عزیز اور طفیل کی نظریں اپنے گاؤں کی طرف — ہموار راستہ — لیکن کتنا پُر پیچ — ہمالہ سے بھی مشکل — نظریں دیکھتی رہیں۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ اور جیپ لکشمی واچ ہاؤس کے سامنے رک گئی۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"ان لڑکوں نے تمہیں کوئی گھڑی فروخت کی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں سردار صاحب! میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ ورنہ میں ابھی تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" انسپکٹر گرجا۔ طفیل کی شناخت پر انسپکٹر نے گھڑی برآمد کر لی اور جیپ واپس چوکی کی طرف چل پڑی۔

"کیوں بھئی کرنیل سنگھ! اب ان لڑکوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔" انسپکٹر رندھاوا نے دونوں لڑکوں کو اپنے خیمے کی طرف لے جاتے ہوئے کرنیل سنگھ سے پوچھا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں صاحب۔"

"کیوں بھئی لڑکو! تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے۔ یا نہیں؟" انسپکٹر نے طفیل کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے پوچھا۔

جی نہیں! لیکن ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟"

"جی! کچھ نہیں۔"

"بھئی! تمہیں تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ پھر انکار کیوں؟"

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر طفیل ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ابا کہا کرتے ہیں کہ اگر کافر کے ہاتھوں کچھ کھاؤ تو گناہ ہوتا ہے۔"

"لیکن بیٹا! کیا میں تمہیں کافر لگتا ہوں؟ میرے بھی تمہاری طرح ہاتھ، پاؤں، ناک منہ ہے اور پھر میں بھی تو اسی خدا کے آگے سر جھکاتا ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ بیٹا ہم سبھی انسان ہیں۔ تمہارے ابا جان کو کسی نے غلط بتایا ہے۔" انسپکٹر نے طفیل کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے سمجھایا۔

"سچ"؟

"بالکل سچ۔"

"پھر تو ہم جی بھر کر کھائیں گے۔ ہمیں بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔" عزیز نے اچھلتے ہوئے کہا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کھانا کھانے کے بعد انسپکٹر رندھاوا نے ڈیوٹی پر کھڑے دو سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا،

"دیکھو بھئی! ان دونوں لڑکوں کو سرحد پار کرا دو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ انکے سپاہی گشت پر نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تو انھیں چھوڑ دیں اور وہ پکڑ لیں۔"

سپاہیوں نے سلوٹ مارا اور دونوں لڑکوں کو لے گئے ـــــ انسپکٹر انھیں دُور تک جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا ـــــ اُس کا چہرہ پھول کی طرح کِھل اٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ لیکن اس کے کانوں میں کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں پڑ رہی تھیں؛

"انسپکٹر نے ان سانپ کے بچوں کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا! اب اس کی خیر نہیں۔ کل تک اسے خود معلوم ہو جائے۔"

آوازیں ابھرتی رہیں ـــــ اور انسپکٹر چپ چاپ اپنے خیمہ میں چلا گیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مجاھد

دن بھر کی ہڑتال، مظاہرے اور ہنگامے دیکھ کر شام کو جب میں گھر پہونچا تو ذاکر کی امی نے کھانا پروسا۔ میں کھانا کھانے ہی لگا تھا کہ ہمسائے میں ایک خستہ جھونپڑی سے ایک عورت کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میں کھانا چھوڑ کر دوڑا ـــــــ

گُلے کی ماں زاروقطار رو رہی تھی ـــــــ "او میرے بیٹے ! تو کہاں چلا گیا۔ ہائے میرے گُلے ـــــــ تمھیں کس ظالم نے مارا۔ اگر مجھے وہ کتّا مل جائے ـــــــ میں اس کی بوٹی بوٹی نوچ لوں ـــــــ پر اپنے گُلے کو کہاں سے لاؤں۔ ہائے، میرے گُلے ـــــــ"

"بہن چپ کر۔ حوصلہ رکھ۔ گلے کو کچھ نہیں ہوا۔ مریں اس کے دشمن۔ اس کی چھاتی میں تھوڑا سا زخم آیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ گُلا بچ جائے گا۔ تم یوں ہی جی ہلکان کرتی ہو۔" ـــــــ ماسی سرداراں گلے کی ماں کو تسلی دینے لگی۔

"تم لوگ مجھے کیوں جھوٹی تسلیاں دیتے ہو۔ بھلا جس کی چھاتی میں گولی لگی ہو، وہ کبھی بچ سکتا ہے۔ ہائے میرے لعل۔ میرے دل کے ٹکڑے ـــــــ"

"یارب سچے! گُلے کو بچالے۔ ہاجرہ کے بڑھاپے کا ایک یہی سہارا ہے۔ جوانی کے شگوفوں کو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دور پھینک کر پت جھڑ کی حدود میں داخل ہو رہی دو بہنوں کی عزت کا رکھوالا۔ ان کے ہاتھ پیلے کرنے کا ذمہ دار۔ اگر گلّے کو کچھ ہو گیا تو ہاجرہ کے ساتھ ساتھ اس کی دونوں لڑکیوں کو بھی لوگوں کے برتن صاف کر کے اپنا پیٹ زکوٰۃ یا خیرات سے پالنا پڑے گا۔ یا پھر اپنی عزت نیلام کرنی ہوگی۔" قادر چاچے نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

"ایک تو یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر طرف گورکھ دھندا چلتا ہے۔ کیا بیوپار اور کیا سیاست بھائی! ہم نے تو اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔ رات کو ایک بات کرتے ہیں اور صبح دوسری۔ شام کو کسی چنار کو سلام کرتے ہیں اور صبح کسی برگد کا دم بھرتے ہیں۔ ہمارے لیڈروں کا یہ چلن.... ان کے لئے تو منافع بخش ہے۔ لیکن ہمیں کب تک یہ مداری کی طرح نچاتے رہیں گے

بھیّا! مختصراً ہمارا علاقہ ایک ایسی سوئی ہے جس کے سوراخ میں سے ہاتھی تو بہ آسانی نکل جاتا ہے مگر دُم اکثر پھنس جاتی ہے۔ پھر یہ دُم اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ چاروں طرف جلسے جلوس مظاہرے، ہڑتالیں اور ہنگامے ہونے لگتے ہیں۔ پر گلّا تو کبھی ایسے جلسے جلوسوں میں نہیں گیا۔ وہ بیچارہ تو ہر روز صبح سیدھا گھر سے ریشم فیکٹری اور وہاں سے واپس شام کو گھر آتا تھا۔ لیکن آج اسے کیا ہو گیا وہ جلوس میں کیسے پھنس گیا۔۔۔۔" ریٹائرڈ ماسٹر غلام غوث قادر چاچا سے مخاطب تھا۔

"ہائے! بڑی آس اُمیدوں سے پالا تھا۔ بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ہائے میری آنکھوں کا نور چلا گیا۔ میرا لعل ظالموں نے چھین لیا۔ میرے گلّے، آ۔ میں تجھے گلے لگاؤں "۔۔۔ ہاجرہ بین کر رہی تھی

موسی! سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے تو چلتے پھرتے انسان کی روح قبض کر لے، اور اگر اس کا فضل ہو تو گولیوں سے چھلنی شخص بھی بچ جاتا ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے موسی ۔۔۔ اور گلّا، وہ تو مجاہد ہے اس نے اللہ کے بنائے ہوئے دین کی عظمت کے لئے اپنی چھاتی پر گولی کھائی ہے وہ اپنے پاک نبیؐ کی بے حرمتی کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ وہ سچا مسلمان ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ کے حکم کی پابندی کرے۔ اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے جہاد کرے اور جو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں ان کا خدا نگہبان ہوتا ہے۔ تم بے فکر رہو موسیٰ!
وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیڑا غرق ہو ان کا ـــــ جنھوں نے ہمیں ان بھیڑیوں کے سپرد کر دیا۔ ان نامرادوں
نے تو ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔" مولوی فضل دین غازیوں کے کارنامے سناتا سناتا
کہنے لگا۔

میں چپ کھڑا سب باتیں سنتا رہا۔ پھر ہسپتال کی جانب چل پڑا۔ گلا وارڈ نمبر دو
کے چوبیس نمبر بستر پر نیم مردہ پڑا تھا۔ گولی اس کی چھاتی سے نکال لی گئی تھی۔ اسے خون
دیا جا رہا تھا ـــــ اس وارڈ میں اور بھی بہت سے زخمی تھے جو آج کی پولیس فائرنگ
اور لاٹھی چارج سے زخمی ہوئے تھے ـــــ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں ہسپتال میں
پہلے بھی گونجا کرتی تھیں ـــــ سن اکتیس میں ۳۱ء ـــــ ۴۴ء میں ـــــ ۴۷ء میں ـــــ ۵۳ء
میں ـــــ ۶۴ء میں ـــــ ۶۵ء میں ـــــ ۷۱ء میں ـــــ زخم ہی زخم، خون ہی خون ـــــ
موت ہی موت ـــــ نعرے کب سے لگائے جاتے رہے ہیں۔ ڈوگرہ شاہی مردہ باد ـــــ
کشمیر چھوڑ دو ـــــ قبائلی حملہ مردہ باد ـــــ ہمارا الحاق مکمل ہے ـــــ الحاق عارضی ہے۔
ـــــ یہ ہمارا ملک ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے ـــــ رائے شماری فوراً کرو ـــــ پاکستان
زندہ باد ـــــ آزاد کشمیر واپس لو ـــــ ہندوستان زندہ باد ـــــ

"ڈاکٹر صاحب! قبر کا عذاب برداشت کر لوں گا مگر اس درد کا عذاب برداشت نہیں
ہوتا، مجھے بے ہوش کر دو۔" ـــــ اور ڈاکٹر گلے کا معائنہ کر رہا ہے ـــــ

"سارے شہر میں صبح سے ہی چھوٹے چھوٹے جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے، جو لال
چوک میں جمع ہوتے گئے۔ وہاں سے ایک بڑا جلوس نکلا۔ جلوس کیا تھا ـــــ انسانوں کا ایک
ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ـــــ نعرے گونج رہے تھے ـــــ" اسلام زندہ باد، نعرۂ تکبیر،
اللہ اکبر ـــــ نعرۂ رسالت، یا رسول اللہ۔ اک نعرۂ پنجتن ـــــ ایک نعرۂ حیدری ـــــ یا علی
ـــــ پاکستان ـــــ نہیں نہیں، آج یہ نعرہ کسی نے نہیں لگایا۔ بھلا ہمیں کیا۔ پاکستان
ہو یا بنگلہ دیش۔ برما ہو یا لنکا، ایران ہو یا افغانستان، امریکہ ہو یا روس، چین ہو یا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

یا جاپان ـــ جلوس ہر جگہ نکلتے ہیں، مظاہرے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ گولیاں ہر دیش میں چلتی ہیں۔ اب کوڑے لگانے، ہاتھ اور ٹانگیں کاٹنے اور پھانسی دینے کا رواج بھی عام ہو چکا ہے ۔ انسان کا لہو ہر ملک میں بہتا ہے ۔ قربانی ہر جگہ دی جاتی ہے ـــ ہاں ! تو میں بتا رہا تھا کہ نعرے لگ رہے تھے ـــ اور گلّا، ایک مجاہد ـــ جلوس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ شعلہ بنا ہوا تھا۔ اس کی چال غازیوں ایسی تھی ـــ واہ واہ ـــ کیا جلال تھا ـــ نعروں کے جوش سے جب غازیوں کا لہو ابلنے لگا تو پھر ـــ پتھر چلنے شروع ہو گئے۔ ساڑھ پھونک، اور توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ سرکار کی پولیس ـــ لاٹھیوں، ٹیئر گیس اور بندوقوں سے لیس، حرکت میں آگئی۔ آپس میں مقابلہ ہونے لگا۔ گولیوں کا مقابلہ پتھروں سے۔ پتھر برستے رہے، گولیاں چلتی رہیں۔ نعرے گونجتے رہے۔ پتھر ـــ لاٹھیاں ـــ آگ ـــ دھواں ـــ بندوقیں ـــ اور ایک گولی گلے کی چھاتی میں جذب ہو گئی ـــ گلا ایک سچا مومن ہے۔ وہ ایک مجاہد ہے اور مجاہد موت سے نہیں ڈرتے۔ گلے نے ایک عظیم قربانی دی ہے، اللہ تعالیٰ ضرور اس کی حفاظت کرے گا ـــ" کریما بولتا رہا ـــ

گلّا ہوش میں آگیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک ڈاکٹر، ایک نرس، کریما اور میں ـــ باقی بستروں پر لیٹے ہوئے زخمیوں کی آوازیں ـــ

"ڈاکٹر صاحب ! میری ماں کہاں ہے۔ میری بہنوں کو بلاؤ۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ اب میری بہنوں کی شادی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اب شاید ہماری کچی جھونپڑی پر گھاس کی جگہ ٹین کی چھت ہو گی" ـــ گلہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں گلے ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

"نہیں ڈاکٹر، نہیں ! اگر میں اچھا ہو گیا تو کچھ نہیں ہو گا۔ میرا مرنا ضروری ہے۔"

"پر کیوں گلے ؟ تم تو مجاہد ہو۔ قوم کو تمھارے ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو مذہب کے لئے ....."

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ! پر آپ مجھے بتائیں کہ میری موت کے بعد سرکار میری ماں کو پیسے دے گی نا۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"پیسے؟ کیسے پیسے؟"

"ڈاکٹر صاحب! کیا ایسے جلوسوں میں ہلاک ہونے والوں کے وارثوں کو سرکار کیطرف سے پیسے نہیں ملتے؟ ابھی پچھلے سال کے مظاہروں میں ہلاک ہونے والوں کے وارثوں کو سرکار نے دس دس ہزار روپے نقد دئے تھے ——"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر ایک دم چونک پڑا۔ مجھے لگا جیسے اسے سارے ہسپتال میں نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہو —— "نعرۂ تکبیر، ہر ہر مہادیو، بولے سونہال"۔ اور میں سوچنے لگا —— یہ جلسے، جلوس، مظاہرے، ہڑتالیں، یہ پتھر، بندوقیں یہ آگ کی وارداتیں —— یہ خون ہی خون، ہسپتال میں بھی خریدا جاتا ہے۔ لہو کی ایک بوتل چالیس روپے ہیں۔ لہو سارے شریر کا —— بھوک مٹانے کے لئے، ایسے بھی مرسکتا ہے؟ —— اور میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر —— ایک پتھر کا بت، گلّو کو دیکھے جا رہا تھا گلّو کی سوالی نظریں پتھر سے ٹکراتی رہیں۔ پتھر چوڑا ہو گیا۔ پتھر پھیل گیا —— پتھر آکاش بن گیا —— اور گلّو کی نظریں آکاش کی دھند میں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سیاست

یووا لوک پرچار سمتی کی طرف سے دیش بچاؤ ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ نئی نسل کے مایوس اور زندگی سے ٹوٹے ہوئے نوجوان روز تقریریں کرتے ـــــ "ملک خدا کا، قبضہ ایرے غیرے نتھو خیروں کا۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس دیش میں چور اُچکے، چوہدری بن بیٹھے ہیں۔ یہاں سچ کی فصل اگانا اور محنت کی کمائی کھانا حرام ہے۔ یہاں گن تنتر، پرجا تنتر اور سوتنتر سب دل بہلانے کے منتر ہیں۔ یہاں پرجا تنتری مریادا بھنگ ہوتی رہے گی۔ کیونکہ عوام آزادی کی بھنگ پی کر سوئے ہوئے ہیں۔ اس آزادی کے نشے میں مست ہیں، جس کی دین بے روزگاری، فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، بدامنی، رشوت، تسکری، بے ایمانی اور مہنگائی ہے۔"

دیش بچاؤ ہفتے کے کارن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں حاضری معمولی تھی۔ مگر شریف اور اعلیٰ گھرانوں کے ودیارتھی...... اپنی اپنی کلاسوں میں جاتے تھے۔ اُنھیں اس طرح کے ڈھونگ رچانے والوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں لگانا چاہتے تھے...... تاکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اچھی اچھی نوکریاں حاصل کی جاسکیں۔ بیوپار اور سیاسی کاروبار میں سرگرمی سے شامل ہو کر دیش کی بہتر طور پر سیوا کی جاسکے۔ کلاسوں میں جانے والے طلبا میں مشہور جنتا سیوک اور "کسان شوگر ملز" کے مالک گنڈا مل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

شاستری کا اکلوتا بیٹا لکھشمن بھی تھا جو کبھی کبھی کالج چوک کے پاس دھرنا دیتے ہوئے اپنے ساتھی طلباء کا تماشہ دیکھنے کے لئے کچھ پل کھڑا ہو جاتا۔ وہ کبھی ودیارتھی لیڈر رام کو تقریر کرتے ہوئے بھی دیکھتا۔

"دوستو! یہاں آزادی کے مجاہدوں، ان کے بہن بھائیوں، بیٹے بیٹیوں، داماددوں اور دیگر رشتہ داروں نے آزادی دلانے کی قیمت پوری طرح وصول کرلی ہے۔ ان سوتنترسینانیوں کے کالے کارناموں کی پُستک جنتا نے پڑھ لی ہے، اب یہ قوم دشمن لیڈر، زیادہ دیر تک اپنے گناہوں کی گٹھری لئے نہیں گھوم سکتے۔ اب ان مجاہدوں اور قومی رہنماؤں کے سیاسی اور سماجی بنکوں میں لوگوں کو بیوقوف بنانے والے نعروں کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے اور بنک دیوالیے ہو گئے ہیں"۔۔۔

رام اور لکھشمن دو گہرے دوست ہیں لیکن خیالات نہیں ملتے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود بھی ان کی دوستی مثالی تھی۔ لکھشمن رام کو سمجھاتا کہ وہ یہ کھیل چھوڑ دے۔ جذباتی تقریروں سے کچھ نہیں مل سکتا وہ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دے، کیونکہ روشن دل و دماغ سے ہی صحتمند سوچ مل سکتی ہے۔ تعلیم ہی سماج میں پھیلی ہوئی ہر بیماری کا علاج ہے۔۔۔ لیکن رام اس کی فضول سی نصیحتوں کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا، "دیکھنا لکھشمن! ہم یہ نظام بدل کر دم لینگے"۔

پھر دھرنوں نے جلوسوں کی شکل اختیار کرلی۔ جلوس شہر کے بازاروں سے گزرنے لگے۔ اندولن پھیلنے لگا۔ جلوس وزیروں کی کوٹھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ مظاہرین کو پولیس روکنے لگی۔ ٹکراؤ ہونے لگا، تشدد بھڑکنے لگا..... اور آخر گولی بھی چل گئی۔ ایک طالب علم مرگیا اور کچھ طلباء زخمی ہوگئے۔ جنتا" دیش بچاؤ ہفتہ" کا نوٹس لینے لگی۔ جلوسوں میں گنتی بڑھنے لگی۔ تقاریر میں زیادہ گرمی آگئی۔ لفظوں کے جادوگر رام کا ایک ایک لفظ لوگوں کے دلوں کو گرما رہا تھا۔

"بہنو اور بھائیو! یہ قومی لیڈر اور ان کے چیلے چانٹے سب خون چوسنے والی جونکیں ہیں۔ یہ لوگ عادی مجرم ہیں ان کی دیش سیوا کی بھاؤنا کے ارتھ لوٹ مچانا ہے۔۔ یہاں بھارتیہ کرن، اسلامی کلچر، ہندو راشٹر اور اسلامی پرچم کا مطلب فرقہ وارانہ فسادات کرانا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ابھی بھی دیش واسیوں کو مندر، مسجد، گرجے اور گوردوارے کی حدود

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سے باہر نہیں جھانکنے دیتے۔ فرقہ وارانہ فسادوں کے لئے یہاں، مذہب ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔ یہ لیڈر اور قوم کے غمخوار راج سنگھاسن پر قبضہ کرنے اور اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انسان خرید کر جلسے کراتے ہیں اور اپنی شہرت کا ڈھول پٹواتے ہیں۔ یہ گندی نسل کے کیڑے دن بہ دن گندگی پھیلا رہے ہیں۔ ان کے آدرشوں کے نمونے، ان کے بیٹے اور داماد ہیں جنھوں نے اندھیر نگری مچائی ہوئی ہے۔ یہ بڑے بڑے سمگلر، چرس اور شراب کے بیوپاری، سٹے باز اور جواری، عورت کے گوشت کو نوچنے والی گِدھیں، ان کے ساتھ ننگی تصویر کھنچوانے والے عیاش، ملک کے راز دشمن کو بیچنے والے قوم پرست...... سب دیش کی عزت کے لیٹرے ہیں —— بھائیو! خدا کا واسطہ ہے، ان کافروں کے فریب میں نہ آؤ۔ ان کے آدرشوں اور اصولوں کا سایہ بھی اپنے بچوں پر نہ پڑنے دو۔ ورنہ ہر گھر میں کافر پیدا ہونگے اور کافر ملک کے ٹکڑے کر دیں گے۔ کیونکہ کافر وہ ہے جو بھگوان کو نہ مانے خدا کو نہ مانے اور اپنی خدائی چلائے۔ جو انسانیت کا قتل کرے۔ ساتھیو! یہ کافر مُنکھتا کا قتل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی خدائی چلائی ہوئی ہے۔ ان فرعونوں کی خدائی کو مٹا کر رکھ دو۔ ان کا تختہ الٹ دو۔ ان کی کوٹھیوں کو جلا ڈالو"۔۔انقلاب، زندہ باد..... انقلاب، زندہ باد...... رام بابو زندہ باد......"

عوامی سمندر میں طوفان آگیا۔ مزدور، ودیارتھی، بے روزگار، بے گھر اور بے زمین لوگ بے اصولی اور عوام دشمن سرکار کو ختم کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ رام کی لگن، ہمت اور خیالات سے آخر لکشمن بھی متاثر ہوا۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا اور رام کو اپنا نیتا مان کر اندولن میں شامل ہوگیا اور وہ بھی تقریریں کرنے لگا۔

"جو سرکار عوام کو روٹی کپڑا اور مکان نہیں دے سکتی، اس کا اقتدار میں رہنا برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ دوستو! میں ایک سیٹھ کا بیٹا ہوں۔ اس سیٹھ کا جس نے جنتا کا ہو چوس کر لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ جس کی ایک شوگر مل ہے۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی حویلی ہے۔ جو مندر، مسجد اور دیگر سماجی بھلائی کے کاموں کے لئے اگر ایک ہزار چندہ دیتا ہے تو سَو گنا وصول کرتا ہے۔ پر پھر بھی وہ جنتا کا سیوک کہلاتا ہے۔ اس نے یہ سب میرے لئے بنایا ہے، لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نہیں ہے۔ کیونکہ میرے دیش واسی بھوکے ننگے ہیں۔ میں دھرتی ماں کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں بھی تب تک بھوکا ننگا ہی رہوں گا جب تک ملک کے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان نہیں مل جاتا۔ اس لئے بھائیو! آگے بڑھو ..... اور مسمار کردو، حرام کی کمائی کی بنی ہوئی یہ حویلیاں۔ جلادو یہ غریبوں کا خون چوسنے والی سرمایہ دار فیکٹریاں "—— جلوس، —— مظاہرے، —— نعرے ——

" عوام دشمن سرکار نہیں چلے گی۔ سرمایہ داری مردہ باد، نادرشاہی مردہ باد" —— دفتروں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہڑتال۔ پتھروں کی بارش، —— لاٹھی چارج، آنسوگیس، گولیاں —— کئی انسانی جانوں کا نقصان۔ سینکڑوں زخمی، توڑ پھوڑ، آگ ہی آگ —— جوشیلا لکھشمن بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا —— پولیس کی مدد کے لئے فوج بلائی گئی۔ سرکار نے اندولن کاریوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا یقین دلایا۔ ودیارتھی لیڈر رام، کچھ شرطوں پر حکومت کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس نے ایک عوامی جلسہ بلایا۔ جلسے سے لکشمن اور دوسرے ودیارتھی لیڈروں نے خطاب کیا اور حکومت کے ساتھ بات چیت کرنے کی سخت مخالفت کی۔ پر شبدوں سے کھیلنے والے رام بابو نے اپنی تقریر میں عوام کو سمجھایا؛

" ہمیں بات چیت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے اصول اور اپنا ضمیر نہیں بیچیں گے۔ ہم بنیادی مانگوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرینگے دوستو! ہم چاند نہیں مانگتے، ہم تو صرف وہ حقوق مانگتے ہیں جو دیش کے آئین نے ہمیں دئے ہیں۔ اگر سرکار نے ہماری مانگیں تسلیم نہیں کیں تو ہم اپنی پرامن تحریک جاری رکھیں گے۔"

جنتا نے زوردار تالیاں بجائیں اور رام بابو کے حق میں نعرے لگائے —— بات چیت کے دوران آندولن روک دیا گیا۔ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے حکومت نے گرفتار کئے گئے طلباء، مزدوروں اور ملازموں کو رہا کر دیا گیا —— گفتگو لمبی ہوتی چلی گئی —— ہر روز ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں خبریں آنے لگیں —— " بات چیت دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ دونوں دھڑے ایک دوسرے کے نظریے کو سمجھنے لگے ہیں۔ ودیارتھی نیتا رام بابو بات چیت سے پوری طرح مطمئن —— سرکار نے عوام کی جائز مانگوں کی جانچ کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے —— حکومت نے مظاہروں میں مرنے والوں کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لواحقین کو دس دس ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تحریک میں جن لوگوں کی جائیداد کو نقصان پہنچا ہے، سرکار کی طرف سے ان کو معاوضہ دیا جائے گا۔"

بات چیت کے نہ جانے کتنے دَور ہوئے۔ اندولن کاریوں کے جذبات ٹھنڈے ہوگئے۔ تحریک مردہ ہوگئی —— اور ایک دن یہ خبر آئی کہ سرکار نے طلبا کو بھی حکومت میں نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا ہے —— پھر کچھ دنوں کے بعد رام بابو کو اَپر ہاؤس کا ممبر بنا کر وزیرِ بے محکمہ بنا دیا گیا —— نوجوان نسل، طلبا، مزدور اور ملازمین بہت خوش تھے۔ لیکن لکھشمن...... جس نے گندی سرکار کو بدلنے کے لئے تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، جس نے رام بابو کو اپنا نیتا تسلیم کیا تھا، جس نے اپنے ماں باپ سے بغاوت کی تھی، جس نے اپنی تعلیم کا ایک قیمتی سال ضائع کر دیا تھا، ہاں وہ لکھشمن ..... ذہنی انتشار میں مبتلا...... بے چین ہواؤں میں گم ہو گیا۔ کسی نے اس کے وجود کو تلاش نہیں کیا —— '

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سورج کا گیت

آج کل مرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ جینا۔ کفن کے لئے اٹھارہ گز لٹھا کوئی سستا تو ملتا نہیں۔ پھر غسل دینا، قبر بنانا، قل کرنا، دسواں اور چہلم کرنا۔ لوگوں کا آنا جانا، قرابت داروں کا جمع ہونا ــــــ خرچ ہی خرچ ــــ ہمارا سماج، ہماری رسمیں ـــ دماغوں کے تالے دلوں کی زنجیریں ــــ توڑے بھی نہ ٹوٹیں۔ ــــــ باتوں سے تو ہم سماج سدھارک اور بڑے ترقی پسند بنتے ہیں لیکن عمل کی کسوٹی پر ہم ہمیشہ کھوٹے سکے ہی ثابت ہوئے ہیں ــــــ یہ باتیں میں اس بیمار کے سرہانے بیٹھ کر سوچ رہا ہوں جس کی دوا دارد نے میری کمر توڑ کر رکھدی ہے۔ یہ بیمار جسم اپنے گلے میں کفن پہننے کی تیاری پچھلے سال سے کر رہا ہے تاکہ گورکن گینتی، کڑاہی اور بیلچہ لے کر شہر خموشاں کو جگانے جائے۔ اخبار سرخیوں میں چھاپیں، دور درشن اور ریڈیو سے یہ خبر آئے ـــــ "جنگ آزادی کا مجاہد اور مغہور ادیب پرویز ہاشمی، موت کی گہری نیند سو گیا۔ قوم کا عظیم نقصان، لیڈروں کے بیان، خراج عقیدت" ـــــــ اور یوں ایک مہان ادیب، جنگ آزادی کا سپاہی، زندہ جاوید ہو جائے گا ـــــــ پرویز ہاشمی، میرا باپ، میری ماں کا قاتل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میری زندگی کے اجڑے باغ کا مالی ـــــ جو اپنے اصولوں، آدرشوں کے پھولوں کو عمر بھر چنتا رہا اور کانٹے میری جھولی میں ڈالتا رہا۔ اس نے اپنی ساری زندگی کاغذی پھولوں کی بناوٹی خوبصورتی میں گزار دی، مگر میرے لئے وہ بدصورتی کا ایک بھیانک سمندر چھوڑ گیا جس میں میرے اجڑے جیون کی ناؤ ڈگمگا رہی ہے ـــ ڈوب رہی ہے ـــ میری امّی! جنگِ آزادی کے اس سپاہی کی معشوقہ، اس کی نظموں کی دیوانی ـــ چنبیلی کی کسی اونچی بیل سے پھسلی اور میرے ابّا کی زندگی کی نظم میں ڈھل گئی۔ نظم پھیلتی گئی ـــ لڑی ٹوٹتی گئی ـــ نظم بکھرتی گئی۔ اس میں وزن نہ رہا، توازن نہ رہا۔ اس میں زہر بھرتا گیا۔ زہر ـــ اصولوں کا ـــ آدرشوں کا زہر ـــ حقیقتوں کا، سچائیوں کا ـــ نظم ایک رات بن گئی۔ سیاہ کالی رات ـــ رات لمبی ہوتی گئی ـــ نائکہ سکڑتی گئی ـــ نائکہ ایک نقطہ بن گئی ـــ اور نقطہ میرے ابا کے اصولوں کی چکی میں پس کر اپنا وجود کھو بیٹھا ـــ پر میرے ابا نے اپنے وجود کے ارد گرد ایک ایسی چادر اوڑھے رکھی کہ آج تک کوئی بھی اسے پھاڑ نہ سکا۔ کوئی اس چادر کو پھاڑتا بھی کیوں۔ بھلا اسے ایسا کرنے سے کیا ملتا ـــ اصولوں کی کڑواہٹ اور آدرشوں کے کانٹے ـــ آج ہمارے اصولوں کا استعمال بڑے سائنٹیفک ڈھنگ سے ہوتا ہے شرافت کی چادر کے نیچے بڑی عزت کے ساتھ ساری بات چیت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی آدرشوں کا پرانا نسخہ کیوں استعمال کرے۔

میرے ابّا، پرویز ہاشمی ـــ ترقی پسند لہر کے جنم داتاؤں میں سے تھے۔ کسی زمانہ میں یہ لہر ایک طوفان بنی ہوئی تھی۔ ہمارا گھر ان دنوں اکثر اس طوفان کے بھنور میں پھنسا رہتا۔ قلم کے نئے نئے غازی، جو آج شیشوں کے قطب میناروں میں اندھے، گونگے اور بہرے بنے بیٹھے ہیں، اپنے اپنے جوہر دکھاتے۔ سامراج، جاگیرداری اور غلامی کی زنجیریں کاٹنے، دیش کی آزادی کے لئے، بھوک ننگ مٹانے اور سوشلزم لانے کے لئے' کتنے ہی کاغذ سیاہ کئے جاتے۔ ادب حقیقی زندگی کا ترجمان بننے لگا۔ "تاج محل" میں غریبوں کا لہو دکھائی دینے لگا۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپا ہر لفظ آگ کا شعلہ بنا ہوا تھا۔ الفاظ بند دماغوں کے دروازے کھول رہے تھے۔ چنگاریاں اندر جا رہی تھیں۔ برف پگھل

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

رہی تھی۔ سفید حاکم آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے۔ ظلم کا کاروبار عام تھا ــــ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ان ہنگاموں سے بے نیاز ــــ "اتر پتر" اور "گیند چکر" کھیلا کرتا ــــ پر ابا کبھی کبھی چچا غفور سے باتیں کیا کرتے۔

"میری طرح منٹو بھی زندگی کی حقیقتیں لکھتا لکھتا بٹوت کے سینی ٹوریم میں جا پہنچا۔ مگر وہاں بھی اسے "بیگو"! "مصری کی ڈلی" بن کر ملی۔ زندگی کی ایک اور سچائی۔ یہ ترقی پسندی کے علمبردار کتنے دور جا پہنچے ہیں۔ لیکن پیچھے رہ گئے سعادت حسن منٹو اور پرویز ہاشمی۔ جن کے حصہ میں صرف جیون کے کڑوے سچ ہی آئے یا مینگو سگریٹ اور شراب ــــ جو تیزاب بن کر ہم دونوں کو پھونک گئی۔ پر ہمارے دل ان سنہری منزلوں کو چھونے کے لئے کبھی نہیں مچلے ــــ لیکن آج ہر چیز مچل رہی ہے۔ ہر شے بدل رہی ہے۔ زمین دن بدن اندر دھنستی جا رہی ہے۔ پھٹتی جا رہی ہے ــــ اور آسمان اونچا ہو رہا ہے۔ اور اونچا ــــ خدا سے بھی اونچا ــــ دھرتی بنجر بنتی جا رہی ہے۔ خالی خالی ــــ اجڑی اُجڑی۔ آسمان میں قوس قزح کے رنگ بکھرتے جا رہے ہیں ــــ اور میں ــــ اس دھرتی کا ایک ذرّہ ــــ آسمان نہیں بن سکتا کوشش کرنے پر بھی نہیں۔ میری رگوں میں پرویز ہاشمی کا خون ہے ــــ اور پرویز ہاشمی ــــ ڈاکٹر کچھ نہیں بتاتے۔ میں کیا کروں۔ میرے پاس تو اب فقط خدا کا ہی نام ہے۔ ایک کلرک۔ تین بچوں کا باپ اور تنخواہ دوائیوں کی چند بوتلیں ــــ

کل لوک سبھا میں خزانہ منتری جی بھاشن دے رہے تھے ــــ "دیش کی اقتصادی حالت سدھر رہی ہے" ــــ روپے کی قیمت ۲۵ پیسے رہ گئی ہے۔ آرتھمک ستھتی ۲۵ پیسے کلو۔ کتنی سستی اور مضبوط چیز ہے۔ پر آٹا، چاول، دال، تیل اور کپڑے کا بھاؤ ــــ اف میرے خدا۔ زندگی ایک مصیبت بن چکی ہے۔ کل سکریٹری صاحب کہہ رہے تھے ــــ،

"بھائی! تم لوگ مہنگائی الاؤنس کے لئے کب جلوس نکال رہے ہو۔ ہمارے پاس تو کار میں پٹرول ڈالنے کے لئے پیسے بھی نہیں بچتے۔"

سکریٹری صاحب کو پیٹرول چاہیئے ــــ کار میں ڈالنے کے لئے ــــ اور ہمیں ــــ پیٹ کی مشین کے لئے ــــ مگر پیٹرول تو بڑا مہنگا ہے۔ ہر دن مہنگا ہو جاتا ہے۔ بیڑا غرق ہو جائے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ان غریبوں کا ـــــ تیل نہ ہوا' ۔ بکاؤلی کا پھول ہو گیا اور مولا آباد رکھے اپنے معزز اور باعزت شہریوں کو' بھلا مہنگائی کے لئے ان کا کیا قصور ہے۔

ابا نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھنے لگے۔ لمبی بیماری کے باوجود ان کے چہرے پر سکون تھا۔ صبر تھا۔ ان کی آنکھیں میرے چہرے کے پھیکے رنگوں کو پڑھنے لگیں انھوں نے اشارے سے دوائی پلانے کے لئے کہا میں نے گھڑی دیکھی۔ دوائی کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے انھیں دوائی پلائی۔ دوائی پینے کے بعد انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"میری اس لمبی بیماری نے تمھیں بڑا تنگ کر دیا ہے۔ میں خود بھی تنگ آ چکا ہوں سال بھر سے چارپائی پر پڑا ہوں۔ سب کچھ چھوٹ چکا ہے۔ سب ختم ہو چکا ہے۔ وہ جوش ولولے جذبات وہ ادب' وہ ادیب ـــــ آج کے بڑے بڑے ڈھنڈورچی۔ میں ان کے ساتھ نہیں چل سکا اپنے اصولوں کے کارن' جو مجھے تم سے بھی پیارے ہیں اور جب تک ان بوڑھی ہڈیوں میں روح کہیں اٹکی ہوئی ہے۔ میں اپنے پیار کو دھوکا نہیں دے سکتا ـــــ بیٹا! ہم نے بڑی محنت سے اس دھرتی پر چرخہ کاتا تھا۔ پر کچھ کر گھے ڈھیلے نکلے اور کچھ کپاس بھی خراب نکلی۔ کاش میں ایک زندہ لاش نہ ہوتا۔ مجھ میں تو اب طاقت نہیں رہی۔ یہ مٹی اب مٹی میں مل رہی ہے۔ لیکن تم تو جوان ہو۔ تمھیں میرے پاس بیٹھ کر کیا ملے گا۔ تمھیں خدا نے طاقت دی ہے عقل دی ہے۔ تم کھیتی باڑی کے نئے نئے طریقے سیکھ سکتے ہو۔ انقلابی کھاد اور شفاف پانی سے چاروں سمت ہریالی لا سکتے ہو۔ تمھیں پریشانی کیوں ہو ـــــ پریشانی کا علاج گھر میں بیٹھ کر نہیں ہوتا۔ اٹھو میرے بیٹے! باہر نکلو' تمھارے ایسے کتنے ہی ساتھی تمھیں تیار ملیں گے۔ تمھیں ان کے ساتھ مل کر چلنا ہے۔ کندھے کے ساتھ کندھا اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر۔ اٹھو! سچی لگن اور محبت سے ہل چلاؤ ـــــ خوب فصل پیدا کرو۔ بنجر زمین آباد کرو۔ بڑے بڑے پتھروں کو بارود سے اڑا دو' دھرتی کو صاف کرو' ان پتھروں سے اور زمین کو ہموار بناؤ ـــــ پھر دیکھنا بیٹا! اس زمین کا ہر ذرہ آفتاب ہو جائے گا۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

باتیں سنکر مجھے لگا کہ پرویز ہاشمی، میرے ابا جان —— آج بھی جوان ہیں۔
لوہے کے ساتھ کھیلنے والے، اور میں —— ان کا بیٹا، ان کی جگہ —— چارپائی پر
لیٹا ہوں —— ایک بیمار ذہن، مردہ جسم، سکڑا وجود —— پھر میں اچانک اٹھا۔ میں
نے کمرے کی کھڑکی کھولی —— میں نے دیکھا —— باہر، دور —— لاکھوں میل دور
سورج کرنوں کی سیڑھی سے آہستہ آہستہ دھرتی پر اتر رہا ہے۔ میں گھر سے باہر
نکل آیا —— اور سورج کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑا —— میری آواز پر ہزاروں
لاکھوں، کروڑوں آوازیں میرے ساتھ مل گئیں۔ آوازوں نے گیت بنایا۔ قدموں
نے تال دیا۔ قدم بڑھ رہے ہیں —— گیت گونج رہا ہے —— گیت سورج
کا —— گیت دھرتی کا —— اور سورج نزدیک آتا جا رہا ہے ——

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ابابیل کا خواب

دیوتاؤں نے جب مریخ پر خوراک پانی اور ہوا کا سب بندوبست کر لیا تو زمین کا ایک بنجارہ اپنی خوبصورت ٹوکری میں رنگ برنگے کھلونے لے کر وہاں بیچنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ وہ ہوائی شٹل پر بیٹھ گیا۔ شٹل کرۂ ہوائی کو چیرتی ہوئی خلا میں داخل ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے چاند ________________ پر رکی اور وہاں کی سواریوں کو اتار کر بحفاظت مریخ پر پہنچ گئی۔ اہلِ مریخ نے دھرتی کے بنجاروں کا شاندار استقبال کیا۔ یوں تو وہ بابا آدمؑ کا نام یُگ یُگ سے سنتے آرہے تھے مگر ان کی اولاد کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور دیکھ کر خوش بھی بہت ہوئے تھے۔ خاص طور پر بنجارے کی ٹوکری میں خوبصورت اور عجیب و غریب کھلونے دیکھ کر

بنجارے نے پہلے ڈگڈگی بجائی، پھر بانسری کے سُر سنائے اور بھیڑ اکٹھی کر کے انھیں کھلونے دکھانے لگا۔ وہ اشاروں کی زبان میں ان سے بات چیت کر رہا تھا۔

"میں دھرتی پر سب سے زیادہ پسندیدہ کچھ کھلونے آپ کے لئے لایا ہوں۔ یہ سب آپ کو مفت ہی مل جائیں گے۔ آپ ان سے کھیل کر دیکھیں۔ اگر پسند آجائیں تو ضرورت کے مطابق بہت ہی سستے داموں آپ کو مال سپلائی کر دیا جائیگا۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پھر وہ ایک ایک کر کے کھلونے دکھانے لگا اور ان کا کمال بھی سمجھانے لگا۔

"یہ فولادی گھوڑا ہے۔ یہ اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو فنا کر دیتا ہے۔ اس کے منھ سے آگ کے گولے نکلتے ہیں۔ جو دور دور تک تباہی مچا دیتے ہیں۔"

"یہ اگنی بان ہے اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ ہزاروں میلوں کا سفر پلک جھپکنے میں طے کر سکتا ہے اور اپنے نشانے کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔"

"یہ 'امبر چھیدک' ہے۔ یہ سدرشن چکر ہے۔ یہ ہوائیاں ہیں۔ یہ جہاں گریں وہاں تباہی مچا دیتی ہیں۔ ایسے ہی یہ ہوائی شیر ہے، یہ فولادی انسان اور یہ ایٹمی طاقت سے چلنے والے کچھ اور کھلونے۔"

"لیکن ان کھلونوں سے کون سا کھیل کھیلا جاتا ہے"؟ سبھی مریخ نواسیوں نے بہ یک آواز پوچھا۔

اپنی طاقت دکھانے، اپنی بات منوانے اور اپنی سرداری قائم کرنے کا کھیل —— اس کھیل میں جو تمھاری بات نہ مانے وہ تمھارا دشمن بن جائیگا۔ پھر تم اسے اور اس کے حامیوں کو ان کھلونوں سے تباہ کر کے سارے مریخ پر راج کر سکتے ہو۔ یہ کھلونے تمھاری حاکمیت کی چمک اور دھمک بن سکتے ہیں۔ تم اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر سکتے ہو —— اور اگر —— اسی طرح کے کھلونے تمھارے دشمنوں کے پاس بھی ہوں تو ہمارے پاس ان کا توڑ بھی ہے۔ یہ سب انسانی دماغ کا کمال ہے ——"

اور بنجارہ فخر سے گردن اکڑا اکڑا کر مسکرانے لگا —— لیکن بنجارے کی بات سنکر سبھی مریخ والے بول اٹھے۔

"مگر ہمارا تو کوئی دشمن نہیں ہے۔ دشمنی ہماری روایات کے خلاف ہے۔ ہماری نسل کے خمیر میں ہی موہ مایا، غصہ اور بغض و کینہ کے جراثیم نہیں ہوتے۔ ہماری دھرتی کبھی بانٹی نہیں جاسکتی۔ یہاں ہوا، پانی اور اناج کی تقسیم نہیں ہوتی۔ پیار محبت برابری اور بھائی چارہ مریخ والوں کے لئے خداداد عطیہ ہیں۔ یہاں کی ہر شے ہم سب کی سانجھی ہے۔ یہاں سب ملکر محنت کرتے ہیں۔ محبت اور دوستی کے گیت گاتے ہیں۔ اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں اور امن و آشتی کے سائے تلے آرام سے سو جاتے ہیں۔ یہاں تیرے میرے کا کوئی جھگڑا نہیں ہے، حاکمیت اور ملکیت کا کوئی دستور نہیں ہے۔ اسلئے ہمیں تمھارے کھلونوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ سب کھلونے لیکر یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ ہم اپنی دھرتی پر نفرت اور جنگ کی فصل اُگانا نہیں چاہتے۔ بھاگو یہاں سے اور پھر کبھی اپنے گندے قدم اس دھرتی پر مت ڈالنا۔"

بنجارہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے سبھی کھلونے سمیٹے اور اپنی دھرتی پر اُتر آیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

علی بابا، چالیس چور

غریبوں مسکینوں اور محتاجوں کی وقت بے وقت مدد کرنے کے باعث الہ دین کا نام سماجی اور سیاسی حلقوں میں جلد ہی مشہور ہوگیا، ملکی خدمات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے حکومت نے الہ دین کو "یوجنا اور وکاس کمیٹی" کا ممبر نامزد کر دیا تھا۔ الہ دین نے کمیٹی کی میٹنگوں میں حصہ لینے سے پہلے پورے علاقے کے حالات کا صحیح جائزہ لینے کا فیصلہ کیا...... اس نے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے، نماز ادا کی اور کل عالم کی بہتری و بہبودی کے لئے دعا مانگنے کے بعد خالص دھات کا بنا ہوا اپنا عہدِ قدیم کا روایتی چراغ صندوق سے نکال کر ہاتھ پر رگڑا۔ رگڑ کھاتے ہی چراغ میں سے "سلیمان جن" نکلا اور الہ دین کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اپنی موٹی سی گردن ذرا جھکا کر بصد عاجزی بولا:

"میرے لئے کیا حکم ہے آقا، آپ نے اس سائنسی ترقی کے زمانے میں مجھے کیسے یاد فرمایا" الہ دین نے جن سے ملکی حالات اور انسانی مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ پورے علاقہ کا جائزہ لے، عوام کے صحیح حالات اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کیے جارہے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کاموں کو دیکھے اور ایک ہفتے کے اندر اندر تحریری رپورٹ پیش کرے۔

بہت دن گذر گئے تو الہ دین نے چراغ کو پھر رگڑا اور سلیمان جن کھسیانی صورت بنائے سر جھکائے اپنے آقا کے حضور حاضر ہو گیا

"کیا حکم ہے میرے آقا؟"

تمھیں میں نے علاقے کی ترقی و بہبود اور جنتا کے حالات کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دینے کے لئے سات دنوں کی مہلت دی تھی۔ کیا تم نے اپنا کام پورا کر لیا ہے۔ میں وکاس کمیٹی کی میٹنگ میں پوری تیاری کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

"میں نے اپنا کام کر لیا ہے میرے آقا! علاقے بھر کی آپ بیتی اور جگ بیتی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ اور ایک خفیہ رپورٹ حضور کے غور وفکر اور ملاحظہ کے لئے تیار کر لی ہے حکم ہو تو وہ رپورٹ پیش کروں۔"

"پیش کرو" —— جن سلیمان نے اپنی واسکٹ میں سے کچھ مڑے تڑے کاغذات نکالے اور آگے بڑھاتے ہوئے بولا: "حضور کوئی اور خدمت میرے لائق ہو تو غلام حاضر ہے۔"

"نہیں! اب تم جا سکتے ہو۔" اور یہ سنتے ہی جن سلیمان نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

الہ دین نے رپورٹ کو بغور پڑھا۔ رپورٹ کے مطابق کچھ چور اچکے ضرور چودھری بن گئے تھے لیکن عوام کی مجموعی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ خاص طور پر دور دراز کے پہاڑی مقامات کے باشندوں کی حالت تو بہت ہی قابل رحم تھی۔ الہ دین کو رپورٹ کا ایک ایک حرف بچھو کی طرح ڈس رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق عوامی حالات میں سدھار لانے کے لئے سرکاری سکیمیں بہت سود مند تھیں۔ مگر ان تجاویز پر عمل زیادہ تر کاغذات میں ہی ہوتا رہا تھا۔ دیہی ترقیاتی سکیمیں زیادہ تر سرکاری ملازموں کا ہی وکاس کر رہی تھیں۔ غریبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے دی گئی سرکاری امداد بڑی سینہ زوری سے غریبوں سے ہتھیائی جا رہی تھی اور بیچارے غریب عوام دن بدن قرضوں کے جال میں جکڑے جا رہے تھے۔ تعلیم، آبپاشی، بجلی، سڑکوں اور بے کاروں کو روزگار دینے کے علاوہ، علاقے کی ترقی اور خوش حالی کے لئے بنائی گئی سکیموں پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ ہو رہے تھے۔ مگر علاقے کا نوے فیصد حصہ اب بھی ہر معاملے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں پسماندہ تھا۔ مثال کے طور پر بجلی کی پیداوار کے لئے ایک ڈیم عرصہ سے بن رہا تھا۔ اربوں روپے خرچ ہو چکے تھے مگر ڈیم ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ لیکن ڈیم بنانے والے انجنیروں اور دوسرے کارندوں کی ڈیم جیسی عظیم الشان کوٹھیاں ضرور بن گئی تھیں۔ فرض شناسی، قومی کردار، نظم وضبط جیسے الفاظ گویا لغت باہر ہو چکے تھے۔ لوگ یہ سارے لفظ بھلا چکے تھے۔ غبن، رشوت خوری اور بے ایمانی، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ اور جین سب کا مشترکہ مذہبی فرض بن چکا تھا۔ مقننہ سے عدلیہ اور عدلیہ سے انتظامیہ تک حرص وہوس اور آپا دھاپی کے دل کش رنگوں کی رنگارنگ بہاریں تھیں اور چہار جانب حصول زر کی لامتناہی دوڑ لگی ہوئی تھی۔

رپورٹ پڑھ کر جن سلیمان کی طرح الہ دین بھی بغلیں جھانکنے لگا اور سوچنے لگا کہ سرکاری ایجنسیاں تو علاقے کی بہت خوبصورت تصویر پیش کرتی رہی ہیں۔ کہیں سلیمان دھوکا تو نہیں کھا گیا اور کہیں وہ غلطی سے پڑوسی ملک میں تو نہیں گھس گیا۔ جہاں کا ذکر ہمارے اخبار، آکاش وانی اور دور درشن اکثر کرتے رہتے ہیں۔ اسے شک گذرا اور اسی شک کی بنا پر اس نے چراغ کو ایک بار پھر رگڑا اور سلیمان سے سوال کیا۔

"یہ تم نے کس علاقے کی رپورٹ تیار کی ہے؟"

"آپ کے ہی علاقے کی حضور! جہاں آپ رہتے ہیں — دوسرے کسی علاقے میں تو مجھے جانے کا حکم ہے نہ اختیار — میں بھلا وہاں کیسے جا سکتا ہوں۔"

"لیکن کیا یہ رپورٹ بالکل صحیح ہے؟"

"بالکل صحیح میرے آقا، سولہ آنے صحیح! لیکن آپ کو شک کیوں گزرا۔ مجھے انسانوں کی طرح جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔ میں تو جن ہوں جن، سچا اور بالکل سچا۔ میں آپ کو اپنی ہتھیلی پر بٹھا کر پورے علاقہ کا دورہ کروا سکتا ہوں، آپ خود اپنی آنکھوں سے ساری حقیقت دیکھ سکتے ہیں۔"

اور ہوا بھی یہی، الہ دین نے جن سلیمان کے ساتھ سارے علاقے کا دورہ کیا اور اُسے یقین ہو گیا کہ رپورٹ حرف بحرف صحیح ہے۔

اور ایک دن جب الہ دین کو ترقیاتی کمیٹی کی میٹنگ میں شمولیت کا دعوت نامہ ملا تو

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ پوری تیاری کے ساتھ راجدھانی کے لئے روانہ ہوگیا۔ سیتم شوم سندرم ہال میں میٹنگ شروع ہوئی۔ ایک طرف علاقے کا پردھان اور کمیٹی کا چیرمین علی بابا ایک عظیم الشان کرسی پر براجمان تھا اور اس کے ساتھ ہی چالیس معزز اراکین کمیٹی الگ الگ کرسیوں پر تشریف فرما تھے وہ اس کے مشیر بھی تھے اور دوسری طرف کمیٹی کے دوسرے ممبر بیٹھے تھے۔ علی بابا کے چالیس مشیر الگ الگ سرکاری محکموں کے اعلیٰ عہدیدار تھے اور اپنے اپنے محکمے کی حسن کارکردگی بارے تفصیلی رپورٹیں تیار کرکے لائے تھے۔

بہرحال اجلاس شروع ہوا۔ علی بابا نے سرکار کی جانب سے مختلف سیکٹروں میں دی گئی رقوم اور کارکردگی کا جائزہ لیا، تفصیل پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد ہر ایک مشیر کو اپنے اپنے محکمہ کے بارے میں تفصیلی معلومات دینے کی ہدایت کی اور ساتھ ساتھ معزز اراکین کمیٹی کو وضاحتی سوال کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ مشیر یکے بعد دیگرے اپنے اپنے محکموں میں ہو رہے کاموں اور خرچ کی گئی رقموں کا ذکر کرنے لگے۔ ہر ممبر اپنے اپنے گاؤں شہر اور علاقے کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ ممبروں کی اکثریت محکموں کی کارگزاری پر مطمئن نہ ہو رہی تھی لیکن انھیں بڑے خوبصورت الفاظ اور اشاروں کنایوں میں خاموش کر دیا گیا۔ مگر الہ دین یہ سب اشارے نہ سمجھ سکا خوبصورت الفاظ بھی اس کے حلق کے نیچے نہ اترے۔ اس نے مشیروں کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ کو مایوس کن اور غیر تسلّی بخش قرار دیتے ہوئے اعداد و شمار کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا اور صدر مجلس علی بابا سے مانگ کی کہ ممبران کو گمراہ کرنے کے جرم میں مشیروں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے کیونکہ سرکاری کام کے نام پر قومی سرمایہ غبن کیا جا رہا تھا۔ الہ دین نے ادھیکاریوں کی جانب سے کی جانے والی بے پناہ لوٹ کھسوٹ کا بھی ذکر کیا لیکن الہ دین کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی کہ سب مشیروں نے بیک آواز اِسے سرکار کو بدنام کرنے کی سازش قرار دیا اور اپنے پر ذاتی حملہ گردانا۔ شور شرابے اور ہنگامے میں ان کی جانب سے یہ مانگ بھی کی گئی کہ الہ دین کو بے چینی پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔

علی بابا نے بڑی مشکل سے اپنے مشیروں کو خاموش کرایا انھیں اپیل کی کہ وہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور سچی لگن اور نیکی کے جذبے کے ساتھ قومی ترقیاتی کاموں میں جُٹے رہیں۔ اس نے کہا:

"یہ مُلک ایک جمہوری مُلک ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی بات کہنے اور نکتہ چینی کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، لہٰذا الہ دین کو بھی اسی بنا پر قابل معافی سمجھا جانا چاہیئے۔" اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:۔" الہ دین جی آج پہلی بار کمیٹی کی میٹنگ میں شامل ہوئے ہیں انکی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہمارا اخلاقی سماجی اور سرکاری فرض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔"

الہ دین، علی بابا کے یہ کلمات سُنکر از حد دکھی ہوا اور چپ چاپ میٹنگ سے اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اندھیر نگری

میں ایک سادہ لوح بندہ تھا۔ میرا پیشہ اس آزاد سمندر میں موتی تلاش کرنا تھا۔ میں عرصہ دراز سے موتیوں کی جستجو میں اس گہرے سمندر میں غوطے لگاتا رہا اور ہر بار موتیوں کے بدلے سیپ ہی پاتا رہا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں اپنی آرزو کی تکمیل میں سمندر کو کھنگالتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنے جنون میں کامیاب ہو جاؤنگا ـــــ لیکن میں ناکام رہا ـــــ میں نے اس سمندر میں بڑی بڑی چٹانوں پر سیپیوں کو بیٹھے دیکھا جو الفاظ کے پیکر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ موتی ہیں ـــــ میں نے ان کو پرکھنا چاہا۔ چنانچہ ایک پہاڑ نما چٹان پر بیٹھے قوی ہیکل سیپ کو میں نے سونے اور چاندی کی کوٹھالی میں پگھلایا۔ پگھلے ہوئے مادے میں میں نے لاکھوں مری ہوئی مچھلیاں دیکھیں جو اس قوی ہیکل سیپ نے ہضم کر رکھی تھیں۔ ان مری ہوئی مچھلیوں سے کہا گیا تھا کہ انھیں زندہ جاوید کر دیا جائے گا اور آزادی سے سمندر میں تیرنے دیا جائیگا مگر آزاد سمندر کا سارا پانی قوی ہیکل سیپ کے اندر دفن ہو چکا تھا اور اب وہاں صرف ایک صحرا تھا کہ جس کی چمکتی ریت، مری ہوئی مچھلیوں کے پیٹ میں پلاسٹک سرجری کے ذریعہ بھر دی گئی تھی ـــــ میں نے ایک اور سیپ کو برفانی تودے پر بیٹھے دیکھا جو لاشوں کا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

سر قلم کر کے سروں کے خول میں دل خوش آوازیں بھرتا جاتا ــــ اور پھر سروں کو دھڑوں کے ساتھ جوڑتا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سبھی آوازیں سیپ کے موتی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں اور اس کے شاندار کارناموں کا قصیدہ پڑھ رہی تھیں ــــ میں نے ایک ایسے جادو بیان سیپ کا بھی نظارا کیا کہ جس نے اپنے کالے جادو کی گرمی سے ہوا کا چلنا بند کر دیا تھا دریاؤں کا بہنا، پرندوں کا اڑنا، پھولوں کا کھلنا، ندیوں کا مچلنا ــــ سب بند کر دیا تھا اس نے۔ پھر بھی پرند چرند، دریا، ندی، نالے، ہوا، پھول، پتے خوش تھے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی سیپ کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتارنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے ــــ میں نے ایک ایسا سیپ بھی دیکھا ــــ جو ہمیشہ اپنے دونوں ہاتھ وسیع آسمان کی طرف پھیلائے رکھتا اور خدا سے ہم کلام ہونے کا ڈھونگ رچاتا۔ حقیقت میں وہ اپنے نفس کے پروردگار کو خوش کرتا۔ وہ اپنے علم کے فریب سے چڑیوں کی چہچہاہٹ کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کی سعی کرتا رہتا۔ بلبلوں کو فریب دیتا رہتا ــــ میں نے اور بھی اَن گنت سیپ دیکھے جو اس بحرِ بےکراں میں اپنی دکان سجائے بیٹھے تھے اور اپنے مال کو موتی ثابت کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آزاد سمندر کے باسی ان سیپوں کو موتی تسلیم کرتے تھے۔ جب میں نے ان پر سیپوں کی حقیقت واضح کرنا چاہی تو چاروں طرف سے آوازوں کا ایک شور گونجا کہ یہ سیپ اصلی موتی ہیں۔ آوازوں کے اس بے پناہ شور میں مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ میں نے سمندر سے معافی مانگی اور آخر کار ان کی بات پر ایمان لایا ــــ کہ یہ سیپ ہی اصلی موتی ہیں ــــ کیونکہ میرے الفاظ اس شور میں اپنے معنی کھو چکے تھے۔

نوٹ:۔ اس افسانے کے مزاج کو مدِّنظر رکھتے ہوئے سیپ کو دانستہ طور پر میں نے مذکر لکھا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

قیامتُ

سات پیالے مٹی کے ـــــ الگ الگ رنگوں کے ـــــ منقش ـــ اس کی بخشی ہوئی خیرات ـــــ

اور میں ـــــ بھوکا، پیاسا صدیوں کا ـــ ایک رنگ کا کشکول لئے ۔ خالی خالی ـــ تنہا تنہا ـــــ کسی نے مجھ کو بھیک نہ دی ۔ کسی نے میرا رنگ نہ دیکھا ـــ میں ویران جنگلوں کا مسافر ـــ گمنام وادیوں میں بھٹکتا رہا ـــــ نسل در نسل ـ صدی تا صدی ۔

پھر اک جرأت رندانہ ـــــ سات پیالے مٹی کے ـــ الگ الگ رنگوں کے ـــــ منقش ـــ ٹوٹ گئے ـــ اور میں ـــ ایک سمندر بن گیا ـــ اس دن سے اس نے گلے میں ایک تختی لٹکالی ۔ جس پر لکھا تھا ـــــ قیامت آگئی ہے ۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

انتظار کا قیدی

میں ایک قیدی ہوں. کال کوٹھری میں قید ــــ اور قید کے یہ طویل دن الگ الگ دائروں میں دھیرے دھیرے گردش کرتے رہتے ہیں. نفسیاتی پریشانیاں، کبھی اُداسی کبھی دکھ ــــ کبھی درد ــــ اور دائروں میں گردش کرنے کے بعد من بہت بے چین ہو جاتا ہے. شدت کے ساتھ ایک انتظار لگا رہتا ہے ــــ کہ اب کوئی آئے ــــ اپنا یا پرایا، دوست یا دشمن. کوئی گفتگو ہو ــــ لیکن کس کے ساتھ. اس کال کوٹھری کی دیواروں کے ساتھ یا اپنے قیدی ساتھیوں کے ساتھ ــــ جو میری ہی طرح اس جیل میں بند کر دئے گئے ہیں، جانوروں کی طرح. ہم تو جانوروں کی ہی اولاد ہیں. ان انسان نما بھیڑ بکریوں کی، جو کوڑیوں کے مول خریدے گئے تھے. یہ بہت پرانی داستان ہے. پر کیا ہوا؟ ــ ہماری جبلت ابھی بھی نہیں بدلی ــــ

یہ جیل کسی بے درد حاکم کا ماتم کر رہی ہے. سامنے اونچی پہاڑی پر بنا قلعہ ــــ تلوار کے زمانہ کا محافظ آج کے زمانہ پر رو رہا ہے. یہ جیل ایک عجیب دنیا ہے. یہاں زندگی کا وجود ہے نہ موت کا. یہاں وہ جیتے جاگتے لوگ ــــ جو ہنستے، روتے، پیار کرتے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور لڑتے ہیں ـــــ سب الف لیلے کی داستان بن جاتے ہیں اور اس داستان کا ایک قصہ میں بھی ہوں ـــــ میں ملزم ہوں ـــ قتل کا ۔ مجھ پر الزام ہے کہ میں نے قتل کیا ہے۔ لیکن مجھے انکار ہے ۔ ایک بار نہیں، سو بار انکار رہے ۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے ۔ اگر میں نے قتل کیا ہے تو وہ لاش کہاں ہے، جس کا قتل میرے ہاتھوں ہوا ـــ مگر جو خود ایک گلی سڑی لاش ہو وہ قتل کیونکر ثابت کر سکتا ہے ـــــ مجھ پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے ۔ ایک سال گذر چکا ہے ۔ کیا ہوا ـــــ فوجداری اور دیوانی مقدمات کو تو کئی کئی سال لگ جاتے ہیں ۔ ابھی تو استغاثہ والوں کی کہانی ختم نہیں ہوئی ۔ اس ماحول میں میری باری، اللہ جانے کب آئے ۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت کی اپنی کوئی قیمت ہی نہیں ۔ اپنا کوئی وجود ہی نہیں ۔ بس فقط یہ دن رات ـــ بار بار اس گلوب پر گھومتے رہتے ہیں ۔ اگر وقت اپنی حقیقت کھو بیٹھے تو پھر سب کچھ ختم ہو جائیگا پر وقت اپنی حقیقت نہیں بدلتا ۔ وہ تو تلخ اور شیریں حقائق کا ایک لمبا سفر ہے ۔ کانٹوں اور پھولوں سے بھرا ہوا ۔ لیکن میرے راستے میں کانٹے ہی کانٹے اُگتے رہے ۔ یہاں پھول کبھی نہیں اُگ سکتے ـــ کیا معلوم ـــ کبھی اُگ بھی جائیں ۔ لالہ کے پھول ۔ سرخ کٹوروں کی طرح ـــ ایرانی شاعری کے من پسند پھول ۔ شیکسپیئر کی جولیٹ کہتی ہے کہ آنے والے وقت میں ہمارے سبھی غم بڑی میٹھی گفتگو کا سامان بنیں گے ۔ اس لئے جو رات بیت جاتی ہے وہ ماضی میں دفن ہو جاتی ہے ۔ صرف آنے والا دن زندہ ہے ۔ اُس کی امید زندہ ہے اُس امید کا گیت زندہ ہے ۔ اُس آنے والے دن کا جشن مناؤ، دوستی اور محبت کے سرمائے کو خرچ کر کے ۔ وہ دن، وہ وقت ـــ جب روحوں کا قتل نہیں ہوگا ـــ اور مجھ پر الزام ہے قتل کا ۔ مگر میں ہتیارا نہیں ـــ استغاثہ والوں نے جرم ثابت کرنے کی خاطر کافی شہادتیں پیش کی ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے ایک لاش کا قتل کیا ہے اس کا سر قلم کیا ہے اور اس کے دماغ میں کیڑے بھر دیئے ہیں ۔ اس کے دل پر لگی پلاسٹک سرجری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں ۔ بھلا لاش کا قتل کیسے ہو سکتا ہے ۔ یہ سب جھوٹ ہے ۔ لیکن یہاں جھوٹ سچ بن جاتا ہے اور سچ، جھوٹ ۔ اسلئے، میں بہت دکھی ہوں ۔ ایک درد ـــ ایک تکلیف میں جی رہا ہوں حیوانی درد کا علاج موت ہے کیونکہ بے زبان مخلوق اپنی بے کسی کا درد بیان نہیں کر سکتی ۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مگر انسان تو درد کو لے کر جیتا ہے۔ کئی برسوں تک۔ صدیوں تک۔ نسل در نسل۔ اس کے درد کا علاج موت نہیں ـــ زندگی ہے۔ اور زندگی جدوجُہد کا نام ہے۔ پر جدوجہد، ہمارے لئے کوئی اور کرے۔ ہم نہیں کر سکتے۔ ہم لنڈی مسجد کے نمازی ہیں اور گونگے کی طرح خواب دیکھ کر دل ہی دل میں پچھتانے والے ـــ اور زندگی جدوجُہد کے بغیر۔ اس جیل میں بڑی بور لگتی ہے۔ چنانچہ بوریت مٹانے کے لئے، چیخوف، فرائڈ، موپساں، گگول، سومرسٹ مام، منٹو، کرشن اور جانے کس کس کمبخت کو پڑھنا پڑتا ہے۔ کافکا کی ڈائری پڑھ کر ـــ بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔ مغل باغات میں کھلے پھول، وہ شامیں جو امیراکدل سے لے کر کافی ہاؤس تک بکھری ہوئی ہیں۔ بادام واری کے شگوفے، ڈل کے رنگ برنگے شکارے، بلیوارڈ کی الھڑ سڑک۔ اس پر چلتے چلتے زندگی کو حسین بنانے کے منصوبے۔ براڈوے اور خیام میں دیکھی فلمیں۔ سَن فلاور، ریڈ بیج، ڈاکٹر زیواگو، ہنڈرڈ رائفلز، اچانک، اُبھار، گرم ہوا، کوشش، گھر اور بے شمار فلمیں۔ جہلم کا بنڈ۔ گلمرگ کا سبزہ زار۔ فیروزپور نالے کا پانی۔ یوسمرگ کے جنگل ـــ ورڈس ورتھ کی شاعری۔ کسی پرانے پاپی کی سفید داڑھی کی مانند چمک رہی اونچی پہاڑیوں پر برف ـــ بہت دیر تک یاد ـــ سانپ بن کر میرے ذہن و دل پر لوٹتی رہتی ہے ـــ پھر سب کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دوپہر کا سورج، پریشان، گرد آلود، فضول سا، شدت کی گرمی، لیکن جب ہوا سرسراتی ہے تو جیل کے اڑھائی درخت اس کی لَے، پر آہستہ آہستہ رقص کرنے لگتے ہیں۔ کال کوٹھری میں بیٹھے ـــ کئی مناظر ابھرتے ہیں، ہوا میں لہراتے ہیں ـــ اور بکھر جاتے ہیں۔ پھر ہر منظر جیل بن جاتا ہے وہ جیل، جس میں، میں قید ہوں۔ قتل کے الزام میں، قتل ایک لاش کا، ایک جسم سے سر جدا کرنے کا، دل کی پلاسٹک سرجری توڑنے کا ـــ یہاں آنے سے پہلے بھی مجھ پر الزام لگتے رہتے تھے۔ گلیوں، بازاروں میں، کھیتوں، کھلیانوں میں، مشینوں کی چمنیوں میں دھواں پھیلانے کے الزام۔ اور کبھی کبھی یہ الزام زنجیروں کی جھنکار بن کر اپنے وجود کا گہرا احساس دلاتے رہتے تھے۔ مگر میں ہر وقت الزاموں کے سیلاب سے بخیریت گزر جاتا۔ لیکن اب تو الزام قتل کا ہے ـــ اور قتل کی سزا موت ہے ـــ موت ـــ پھانسی کا پھندہ یا فائرنگ سکاڈ کی ایک گولی ـــ اور قتل کا یہ الزام دن رات ـــ میرے دل اور دماغ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں گونجتا رہتا ہے، ڈستا رہتا ہے۔ پھر بھی اس پراگندہ ماحول میں من کا موسم کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے ــــ پھر رات کا چاند، آسمان کی ریشمی چادر پر انگ انگ لہراتی چاندنی، کوئل کی کوک بہت اچھی لگتی ہے اور کیٹس کا قول یاد آجاتا ہے کہ حقیقت حُسن ہے اور حسن حقیقت۔ اس وقت حسن کی حقیقت دل کو جیل سے بہت دور لے جاتی ہے ــــ دیوداروں اور آبنوں کے درختوں کی خوشبوئیں۔ ندیوں کے مدھر سنگیت میں۔ پھر دل یہ نہیں مانتا کہ میں جیل میں ہوں۔ قتل کے الزام میں ــــ کال کوٹھری میں۔ کاش میری کال کوٹھری پر بجلی گرے، ایک خوفناک آواز آئے، حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کی آواز سے بھی بھیانک ــــ وہ آواز، جس سے چٹانیں اور ہزاروں ٹن وزنی برف کے تودے لڑھک جائیں۔ پہاڑوں کی بنیادیں ہل جائیں ــــ لیکن ہمارے لوگوں کے بے حس وجود ــــ پہاڑوں سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ ان کو شاید کوئی ایٹم بم بھی نہیں ہلا سکتا۔

میں روز علی الصبح جاگتا ہوں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ۔ پھولوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، ہوا کا سنتور بجنا ــــ پھر سورج قلعہ کی اونچی دیواروں سے باہر نکل آتا ہے ــــ جیل خانہ جاگ اٹھتا ہے اور دل پھر اُداس ہو جاتا ہے۔ کسی اپنے کی یاد بہت ستاتی ہے ــــ اور جب اپنا کوئی ملاقاتی آجائے تو بڑی خوشی ہوتی ہے مل کر۔ مگر ملاقات کے بعد اکیلے پن کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کچھ ڈھونڈتی ہیں۔ کچھ کھویا ہوا۔ پھر طویل اور بے رنگ راتیں اور اجڑے دن، کھانے کو آتے ہیں ــــ پھر یہ جیل، جیل کی اونچی دیواریں، پہریدار، وردیاں، سلاخیں ــــ دائرے گردش کرتے رہتے ہیں ــــ

کل میرا وکیل آیا تھا۔ مقدمے سے متعلق باتیں کرتا رہا۔ کچھ کاغذات پر دستخط کروا کر لے گیا۔ جاتے جاتے کان میں دھیرے سے کہہ گیا ــــ "ہواؤں کا چلنا بند کر دیا گیا ہے۔ دریاؤں کا بہنا، ندیوں کا مچلنا، پھولوں کا کھلنا، پرندوں کا اُڑنا ــــ سب بند کر دیا گیا ہے" ــــ اور میرے ذہن میں کافی دیر تک قتل گونجتا رہا ــــ قتل ــــ قدرت کے بخشے ہوئے حقوق کا قتل۔ لیکن وہ کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ وہ تو عالم پناہ ہے۔ قاتل تو ہم ہیں ــــ اِس جیل کے قیدی ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جیل میں اداسیاں اور بدنصیبیاں بہت ہیں ــــ پر جینے کی خاطر، ہنسنے کے لئے دل لگانے کے لیئے ــــ لتا اور طلعت کے پرانے فلمی نغمے، مہدی حسن، غلام علی، طاہرہ سیّد کے گیت اور غزلیں، شوکت اور یونس کی آوازوں میں سیف الملوک اور ستی ہاشم کے دوہے سننے کو مل جاتے ہیں۔ کل طاہرہ سید بچوں کی ایک لوری گا رہی تھی، "اللہ اللہ کر یا کرو، خالی دم نہ بھریا کرو" ــــ اور مجھے لگا کہ میں ایک بچہ ــــ لہروں کی طرح چنچل اور پھولوں کی طرح نازک طاہرہ سیّد کی گود میں بیٹھا، لوری کی مست آواز میں ڈوبا، سو رہا ہوں ــــ کہ سوتے ہوئے بچے کو ریشماں کی لوچ دار آواز نے جگا دیا

"ــــ ہائے او ربا نئیں اوں لگدا دل میرا"

کبھی کبھی کوئی اچھا ڈرامہ بھی سننے کو مل جاتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ــــ فلسطینی مجاہدوں کے کارناموں پر ایک ڈرامہ نشر ہوا۔ کہانی، مکالمے، آوازیں، ہر لحاظ سے ایک عمدہ ڈرامہ تھا۔ یہودیوں کی بربریت کی داستان ــــ جو کبھی خود بھی مظلوم ہوا کرتے تھے ــــ اور ان کے ہاتھوں فلسطینیوں کے قتل عام کی کہانی ــــ لیکن ہمارے ہاں ــــ قتل عام نہیں ہوتا قتل کے الزام لگتے ہیں ــــ یہاں گونگے گڑ کھا کر سو جاتے ہیں ــــ

کل ایک بڑا سایہ ہماری جیل میں داخل ہوا، کئی چھوٹے چھوٹے سائے ہمراہ لئے اس نے ساری جیل کا معاینہ کیا۔ میری کال کوٹھری کی جانب اشارہ کر کے وہ کہنے لگا، ــــ

"اس کال کوٹھری میں، میں بھی چار برس تک قید رہا ہوں" ــــ پھر وہ بڑا سایہ قیدیوں کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ بالکل اسی طرح ــــ جس طرح قید کے ایام میں، اس کے ساتھ اس وقت کے سایوں نے کی ہوگی ــــ

"تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں؟" ــــ جیل میں بھلا کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ جیل تو آرام گھر ہوتا ہے۔

پھر وہ قیدیوں سے علیحدہ علیحدہ پوچھنے لگا۔

"تم کس جرم میں یہاں آئے؟"

"چوری کے جرم میں۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"تم" ؟

"دفعہ ۳۰۷ کے جرم میں۔"

"تمھارا کیا جرم ہے ؟" — اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا کوئی جرم نہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

"پھر تم یہاں کس طرح آئے۔" ؟

"مجھ پر الزام ہے کہ میں نے قتل کیا ہے۔ ایک لاش کا۔ بھلا تم ہی کہو کہ لاش کا قتل کس طرح ہو سکتا ہے ؟ کبھی کوئی مری ہوئی شے کا بھی قتل کرتا ہے ؟ میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔ میں ہتیارا نہیں۔ میں لاشوں کا بیوپاری نہیں۔ چلتی پھرتی لاشوں کا۔ میں تو زندگی چاہتا ہوں — قتل نہیں — لیکن تم بھی تو اس کال کوٹھری میں چار سال تک قید رہے تھے، تمھارا کیا جرم تھا ؟ کیا تم نے بھی کوئی قتل کیا تھا ؟"

بات سنتے ہی وہ چھوٹے سایوں کی طرف دیکھنے لگا، جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے — پھر جیل کا بڑا پھاٹک کھلا — اور وہ بڑا سایہ تیز تیز قدم بھرتا باہر چلا گیا — میرے سوال کا جواب دیئے بغیر — ان کے جانے کے بعد سپاہیوں نے لوہے کا پھاٹک بند کر دیا — پر میرا سوال — میرا سوال — لوہے کا پھاٹک چیر کر اس کا پیچھا کر رہا ہے — ایک دائرہ بن کر اس کے آگے پیچھے گردش کر رہا ہے — اور گردش کرتا رہے گا —

(فیض کی جیل ڈائری سے متاثر ہو کر)

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

صلیبِ ذات

وہ ایک ننھا بادل — جو آسمان پر لٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گرجنے لگا۔ اس کی ہلکی ہلکی آواز میرے کانوں میں پڑنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

" جا بھاگ جا یہاں سے۔ یہاں طوفان آنے والا ہے۔ میری جسامت بڑھنے والی ہے۔ میں پھٹنے والا ہوں اور تیری دھرتی پہ تباہی مچانے والا ہوں۔ کیونکہ تیری زمین پر سبھی باون گز کے بن مانس بستے ہیں۔ میں ان کا قد گھٹانا چاہتا ہوں اور انھیں الگ الگ سائز کے فریموں میں فٹ کر کے راجہ امبھی کی سمادھی پر لٹکانا چاہتا ہوں — سنو! یہ رازداری کی بات سنو۔ آؤ — میرے نزدیک آجاؤ۔ آؤ نا...

لیکن تم میرے پاس کیسے آسکتے ہو۔ تم تو زمین پر ہو — اور میں ایک بادل — ہزاروں گیلن بھاری پانی لئے — آسمان پر لٹک رہا ہوں — اچھا چلو! وائرلیس سیٹ کے ذریعہ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ تم وائرلیس سیٹ کا سوئچ آن کرو اور میری بات غور سے سنو — ہاں تو میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں بادل بننے سے پہلے تمھاری زمین کا ایک مشہور پلینٹ تھا — تمھاری زمین میرے محور کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گرد گھومنے لگی تھی۔ تمھاری زمین کے مٹیالے ذرّے مجھے دیکھ کر حرارت پکڑنے لگے تھے اور رینگنے لگے تھے۔ میرے وجود نے ان کو ایک انجانی طاقت بخشی تھی۔ میں ان ذرّوں کو اشرف المخلوقات کی جون میں لانے کے لئے سائنسی تجربے کرنے لگا تھا ــــ چنانچہ میں ایک ایسا انجکشن تیار کرنے میں مگن ہوا جو ذرّوں کے انسانی جون میں آنے کے بعد انھیں اتنی زبردست طاقت بخش دے کہ پھر کوئی ان کی جنس کو تبدیل نہ کر سکے ــــ میرا یہ عمل تمھاری زمین کے اونچے ٹیلوں پر رہنے والے باون گزیے بن مانسوں کو ایک آنکھ نہ بھایا ــــ انھوں نے مجھے میری رسد گاہ میں آن دبوچا وہ مجھے گرفتار کر کے لے گئے ــــ اور مجھے ایک بوسیدہ مکان کے برج پر ٹنگی ہوئی آدم خور عدالت میں پیش کیا۔ مجھ پر فرد جرم لگائی گئی کہ میں شیطان ہوں، کافر ہوں۔ مکار سقراط کا جانشین ہوں اور نظام قدرت میں دخل دیتا ہوں ــــ میں نے صحتِ جرم سے انکار کیا ــــ لیکن میرے انکار سے کیا ہوتا۔ انھوں نے مجھے زہر کا پیالہ دیا۔ پھانسی کا پھندہ دیا۔ میں نے زہر کے پیالے کو چوما۔ پھانسی کے پھندے کو گلے لگایا ــــ اور یوں میں قتل کر دیا گیا ــــ اس روز سورج نہیں نکلا، چاند بھی نہیں۔ اس روز تمھاری زمین کی گردش بھی بند رہی۔ چوگرد اندھیرا پھیل گیا ــــ بہت گہرا دھواں دار اندھیرا۔ آسمان سیاہ ہو گیا ــــ لیکن کوئی بجلی نہیں کڑکی ــــ البتہ آوازوں کا ایک کہرام مچا۔ بھلا بن مانس آوازوں کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ انھوں نے آوازوں کے جنگل میں آگ لگا دی۔ درخت کاٹ ڈالے۔ جنگل سوکھ گیا ــــ اور بظاہر میرا لہو پانی ہو گیا ــــ لیکن میں فنا نہیں ہوا۔ میں نے بادل کی جون میں جنم لیا اور خود کو آسمان پر لٹکا لیا۔ تاکہ تمھاری زمین کے بن مانسوں پر قہر بن کر نازل ہو سکوں ــــ

پھر موسم بدلا۔ سورج کا تپتا گولہ زمین پر اُتر آیا۔ درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ شہر قصبے، دیہات، دریا، مکان، جھونپڑیاں، کھیت، چمنیاں ــــ سب پر تپتے سورج کا رنگ چھا گیا۔ ذروں نے اپنی اپنی چھاتیوں پر کراس کے نشان کھدوا دئے۔ وہ صلیبیں اٹھائے میرے مقتل کے گرد کھڑے ہو گئے۔ ان کے تپتے چہروں سے آگ ٹپکنے لگی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور تیز کرچیں بن گئیں ــــ لیکن کرچوں کا سفوف بنا دیا گیا ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مگراب ـــــ اب میں آسمان پر لٹکا ہوا بادل پھیل چکا ہوں۔ میری جسامت بڑھ گئی ہے۔
مجھ میں لاکھوں کروڑوں گیلن بھاری پانی جمع ہو چکا ہے ـــــ میں پھٹنے والا ہوں اور تمھاری زمین
پر تباہی مچانے والا ہوں۔ کیونکہ تمھاری زمین پر سبھی بادن گزیے بن مانس بستے ہیں۔ میں ان کا
قد گھٹانا چاہتا ہوں۔ لہذا تو بھاگ جا ـــ بھاگ جا ـــ بھاگ جا ـــــ"

آواز پھیلتی ہے اور پھر اچانک کٹ جاتی ہے۔ میں تھر تھراتی نظروں سے آسمان کیطرف
دیکھتا ہوں۔ میرا وائرلیس سیٹ خراب ہو چکا ہے ـــــ ایک زلزلہ آتا ہے۔ بادل پھٹتا
ہے۔ آگ کا دریا بہتا ہے۔ زمین سورج دیوتا سے پناہ مانگتی ہے۔ اور میرے کانوں میں
وہ آواز گونج رہی ہے کہ بھاگ جا یہاں سے ـــ بھاگ جا ـــ بھاگ جا ـــ بھاگ جا۔
ـــــ میں سوچ رہا ہوں کہ زمین سے بھاگ کر کہاں جاؤں ـــ شاید پاتال میں
لیکن پاتال کے دروازے تو بند ہیں ـــــ اور فرمان ہے کہ پاتال کے دروازے
قیامت کے دن کھلیں گے ـــ پھر ـــ میں ـــ کیا کروں ـــ کہاں جاؤں
سوچتا ہوں کیوں نہ بادل کے بھاری پانی میں سما جاؤں ـــــ آگ کے دریا میں غرق
ہو جاؤں ـــ تاکہ ـــــ کسی نئی جون میں جنم لے سکوں ـــــ میں کیا کروں ـ
ـــ کہاں جاؤں ـــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھوشیہ وانی

بھوشیہ کال میں حالات ایسے ہو گئے کہ مہا پرشوں نے پہلی بار اپنے اوپر آسمانی قہر نازل ہوتے دیکھا جہاں مہاتما جن رہتے تھے، وہاں ایک طوفان آیا۔ بڑا بھیانک۔ پتھریلے اولے پڑے اور ریت کی ورشا ہوئی۔ مہا پرشوں کے بھگوان مہاراج ادھیراج کا کہنا تھا کہ آسمانی قہر ان پر نازل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا:۔۔۔

"ہم تو آسمانی حکم کے تابع رہ کر اس سرشٹی کو چلاتے ہیں، ہم تو آسمان کی سب سے پیاری مخلوق ہیں ۔۔۔ آسمان ہم پر مہربان ہے۔ یہ طوفان کیڑے مکوڑوں کے پر نکلنے کے کارن آیا ہے۔"

پھر طوفان پھیلنے لگا اور مہا پرشوں کو اپنا سب کچھ اس طوفان میں بہہ جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔ شیشوں کے گھر چکنا چور ہونے لگے۔

پھر یوں ہوا کہ سارے مہا پرش طوفان سے بچنے کے لئے بھوشیہ کال سے نکل کر بھوت کال میں آ گئے وہ سارے پراچین کال کی آس پاس میں جنگلوں، پہاڑوں صحراؤں اور وادیوں میں سفر کرنے لگے تاکہ اپنے لئے کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈھ سکیں اور وہاں پناہ لے سکیں۔ مہا پرشوں کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اس قافلے کی سربراہی بھگوان ادھیراج آپ شاکھشات کر رہے تھے۔ وہ سارے سونے چاندی کے رتھوں پر سوار تھے ـــــ اپنے دلدار پریواروں کو ساتھ لیئے۔ ان کے پیچھے سرکھشا دل کے ویر جوان پیدل چل رہے تھے۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھوں میں تیر تفنگ، نیزے، بھالے اور برچھے لیئے ہوئے۔ تاکہ بھوشیہ کال کے شترو کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکے اور طوفان کے بھنور سے باہر نکلا جا سکے۔ کارواں چلتا جا رہا تھا اور بھگوان ادھیراج کی عقابی نظریں پناہ گاہ کی تلاش میں لگی تھیں۔ سفر تھکا دینے والا اور راستہ تکلیف دینے والا تھا۔ ریتلی دھوپ اور سفر کی مشکلوں کے باوجود سارا قافلہ بھگوان ادھیراج کی سربراہی میں ایک ایسے مقام پر جا کر رُکا جہاں کبیر کے سمے کا ایک اتی سندر اور اتی شرکھشت قلعہ بنا ہوا تھا۔ اس قلعہ میں کبیر کی ساری دولت دھرتی کے اندر محفوظ پڑی تھی۔ پر قلعے کے دربان کے سینے پر لکھا تھا :ـــــ

کاگا کرنگ ڈھنڈو لیا، سگلا کھایا ماس

اے دو نیناں مت چھویو پر دیکھن کی آس

کارواں کے سردار مہاراج ادھیراج نے قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دربان کی دونوں آنکھیں نکال کر کھالیں۔ تاکہ پر دیکھن کی آس سدا کے لیئے ختم ہو جائے۔ مہاپرشوں کا قافلہ بڑی شان سے قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعے میں رہنے والی خلقت کاٹھ کی ہانڈی میں روٹی پکا رہی تھی اور مل کر گا رہی تھی ـــــ

روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ

جنہاں کھادیاں چوپڑیاں گھنے سہن گے دُکھ

مہاپرشوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ان کا پرجوش سواگت ہوا۔ مہاپرش بہت خوش ہوئے ـــــ پھر مہاپرشوں نے سوچا کہ کیوں نہ قلعے کی خلقت کو بھوت کال کے حقیقی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قلعے کی خلقت کو کبھی چوپڑی نہیں کھانے دیں گے اور انھیں گھنے دکھوں میں کبھی گرفتار نہیں ہونے دینگے۔ بلکہ ان کی ہڈیوں کا بالن جلا کر کاٹھ کی ہانڈی میں بھوک اُبالیں گے اور انھیں خوب کھلائیں گے ـــــ پھر ایک دن مہاراج ادھیراج نے قلعے کے اندر اُگے ہوئے ایک پہاڑ پر چڑھ کر سب کو اپنے بھگوان ہونے کا ثبوت دیا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

انھوں نے خلقت کو بلایا اور کاٹھ کی ہانڈی کی خوبیوں سے بھری ایک پستک قلعے کی خلقت کو بخشی۔ سبھی مہاپرشوں نے مل کر اس پستک کو مہاراج ادھیراج کی شبھ وانی کا روپ دیا۔ وہ شبھ وانی ساری خلقت نے زبانی یاد کر لی۔ جلد ہی پستک کی تاثیر نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ قلعے کی ساری خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی شردھالو بن گئی۔ وہ لوگ کاٹھ کی ہانڈی کی مورتیاں بنا کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر گئے۔ مہاراج ادھیراج اور سبھی مہاپرش ان کے ارپن کئے ہوئے شردھا کے پھولوں کو اپنی جھولیوں میں ڈالتے رہے۔ کبیر کی دولت کے خزانے دھرتی کے اندر زیادہ محفوظ ہوتے گئے۔ خزانوں کی مالکی، مختاری اور سرداری مہاپرشوں کا مقدر بن گئی۔ اور شردھا وفاداری اور تابعداری قلعے کی خلقت کا فرض قرار دیدی گئی۔

مہاپرشوں کی دیا درشٹی سے قلعے کی دیواریں اونچی اور پکی ہو چکی ہیں۔ اب مہاپرشوں کو قلعے پر کسی شترو کے حملہ کا ڈر نہیں رہا۔ کسی طوفان کا کھٹکا نہیں رہا۔ اب کسی سیلاب میں بہہ جانے کا خدشہ نہیں رہا۔ خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی پجاری ہے ـــــ مہاپرش بے خوف ہو کر.... قلعے کے اندر بڑی نمرتا اور عاجزی سے شیشوں کے گھر بنا رہے ہیں۔ مہاپرشوں کے بھگوان۔ مہاراج ادھیراج کا فرمان ہے کہ انھوں نے سمے کو اپنی مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ وقت کی گردن مروڑ دی ہے۔ وقت ان کا قیدی ہے۔ اب دوبارہ بھوشیہ کال کبھی نہیں آسکتا۔

قلعے کی ساری خلقت مہاراج ادھیراج کی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتی ہے۔ اور پراچین کال کے دستور کے مطابق وہ ہر روز مہاپرشوں کے ہر حکم کے آگے سیس جھکاتے ہیں۔ سبھی خوش ہیں کیونکہ سرشٹی چل رہی ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نئے آدم کا خواب

سڑک کو اکھاڑنے کے لئے کدال جب سڑک کے چوڑے سینے میں بھونکی گئی تو اس کا سارا شریر کانپ اٹھا۔ وہ اپنی بربادی اور بدنصیبی کی تصویر کو سامنے ایزل پہ سجے کینوس پر دیکھ رہی تھی۔ رنگوں کا ایک کلاکار پنسل سے کئی زاویے کینوس پر بنا رہا تھا۔ اس سڑک پر چلنے والے، ساتھ والی گلیوں سے گزرنے والے مسافر، سڑک کو اجڑتے دیکھ رہے تھے۔ پر وہ سب خاموش تھے۔ وہ بولتے بھی کیونکر۔ ان پر تو انگلیاں اٹھتی ہیں۔ انگلیاں .... چھوٹی، بڑی، لمبی، موٹی انگلیاں ـــــ اس سڑک کو شنگار نے کے الزام میں۔ انگلیوں کا کہنا ہے کہ جب ملگجی شام کا دھندلکا پھیلنے لگتا ہے تو سڑک کی روشنیاں اپنی آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ پھر اس سڑک پر، ساتھ لگتی گلیوں میں، سڑک کے دونوں کناروں پر سجی دوکانوں میں .... لاجوردی، پکھراجی، زمردی، فیروزی اجالے تھرکنے لگتے ہیں۔ پھر یہ سڑک ایک ایسے جزیرے کا روپ دھار لیتی ہے جہاں زندگی کے کئی رنگ، رنگوں کے صحرا میں جذب ہو جاتے ہیں ـــــ اور ایک ہی رنگ میں گھل جاتے ہیں ـــــ اور دیکھنے والی ساری آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر ان آنکھوں سے ایک ہی رنگ ٹپکنے لگتا ہے۔ میلا سا زہر آلود، پیپ سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لت پت، گندھگ ایسارنگ ــــ اور انگلیاں اس سڑک پر چلنے والوں کے قدم ناپتی رہتی ہیں اور جو اس سڑک کو تباہی سے بچانے کے لئے کچھ کر سکتے ہیں، وہ خوش ہیں کیونکہ وہ تو اسے مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ سڑک ایک دھوکا ہے ــــ سراب ہے ــــ ایک سپنا ہے، حقیقت سے بہت دور۔ اس سڑک کو ویران بنانے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں کبھی بھی اس سڑک کی صحیح پہچان میسر نہیں ہو سکی۔ انھوں نے اس کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی بہت کوشش کی، لیکن سڑک ہمیشہ رشتہ توڑ دیتی رہی ــــ کیونکہ گھوڑا گھاس سے یاری لگائے تو بھوکا مر جائے۔ یہ سڑک جو دور آگے چل کر حبر نیلی سڑک سے جا ملتی ہے بے شمار پگڈنڈیوں کو جنم دیتی ہے ــــ اور پگڈنڈیوں پر چل چل کر صندل کے پاؤں جانے گھستے کیوں نہیں ــــ مگر آج یہ سڑک ــــ اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی ہے۔ کدال اس کا سینہ چیر رہی ہے۔

سڑک کے کناروں پر سجی دوکانیں ــــ یہ سائیکلوں کی دوکان، قسم قسم کے سائیکل ہیرو، اٹلس، فلپس، ہرکولیس، ٹائر، ٹیوبیں اور سپئیر پارٹس سے بھری دوکان۔ یہ حلوائی کی دوکان ــــ دودھ، دہی، ملائی، پیچ دار جلیبیاں، برفی، موتی چور کے لڈو، رس گلے من پسند مٹھائیاں ــــ ڈاکٹر کا کلینک ــــ خون، پیشاب، تھوک ٹیسٹ کرنے کے آلات، خاندانی منصوبہ بندی کے پیچ وخم سنوارنے والے اوزار ــــ کتابوں کا سٹال ــــ ہر قسم کا مال، سکولوں، کالجوں کی کتابیں، شکسپیئر کے ڈراموں سے لے کر ــــ جل پری، کام پیتر، رسونتی، پلے بوائے ــــ اندھیرے میں غرق کرنے والی اور بہت سی کتابیں، ننگے پن کا لاؤ لشکر، سن مائکا کی خوبصورت جلدوں والی کتابیں، چکنی اور ملائم ــــ جن پر سر چیر پھسل جائے، ان کتابوں کو پڑھ کر ضمیر ایک کتے کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور کتے کے گلے میں پڑی زنجیر کھل جاتی ہے۔ وہ تب تک آوارہ گھومتا رہتا ہے جب تک اُسے گوشت کا ٹکڑا نہیں مل جاتا۔ ان کتابوں کو پڑھ کر پیراہن میں آگ لگ جاتی ہے، مگر آگ کے چہرے ٹھنڈے رہتے ہیں۔ برف کے غلاف اوڑھے۔ فرج میں لگے ہوئے اس سڑک کے ساتھ کئی گلیاں ملتی ہیں اور یہ بغل والی گلی ــــ مختلف رنگوں سے آراستہ ــــ بہت مشہور ہے۔ یہاں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

عیاشی، خرمستی، بدنصیبی اور کئی دوسرے روگوں کا علاج ہوتا ہے۔ ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک علاج ـــــ یہاں لوگ اپنا علاج کرانے آتے ہیں۔ بڑی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بہت دیر تک تو باری ہی نہیں آتی۔ رنگوں کا کلاکار بھی یہاں کئی بار آیا ہے۔ ساگر پھلانگ کر، پہاڑوں میں پھیلی ہوئی لمبی لمبی پگڈنڈیوں اور میدانوں کا سفر طے کرکے ـــــ اپنا علاج کرانے۔ علاج ـــــ اندھی آنکھوں میں روشنی بھرنے کا، انسانی جسم کا ایکسرے کرنے والی آنکھوں کا۔ لوگوں کے بخشے ہوئے الفاظ کے معنی ڈھونڈنے کا ـــــ یہ کل یگ ہے یہاں ہر شے کا علاج مل جاتا ہے۔ یہاں روشنی بھری پڑی ہے۔ لیکن روشنی کے احساس کو اپنے اندر زندہ کون کرے ـــــ یہ سڑک، یہ گلی، کلاکار سے بہت کچھ مانگتی ہے۔ یہاں چلتی پھرتی بے نور آنکھیں ـــــ ایک سوال بن کر اس کے چہرے پر اٹک جاتی ہیں۔ لیکن یہ سوال تو دوسرے لوگوں سے بھی اپنا جواب مانگتا رہتا ہے، جو کلاکار کی طرح ہی ان گلیوں کے راہی ہیں ـــــ وہ سوال کا جواب دینا چاہتا ہے مگر یہاں کی دھندلی شامیں روشن راتیں جواب سننا ہی نہیں چاہتیں۔ یہاں مسافر سجی سجائی دکانوں کے شوکیسوں میں بکاؤ چیزوں کو دیکھتے رہتے ہیں، پرکھتے رہتے ہیں اور پھر من پسند چیز کو منھ مانگے داموں خرید لیتے ہیں۔ شوکیس میں پھر کوئی نئی شے سجا دی جاتی ہے ـــــ خرید و فروخت کا یہ بیوپار، لین دین کی یہ تجارت بڑے زوروں سے چلتی رہتی ہے، کیونکہ وقت کا بنجارہ یہ کاروبار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتا آیا ہے۔ یہاں بالکل کاروباری منڈی کا منظر ہوتا ہے اور سڑک پر مسافر چلتے رہتے ہیں ـــــ دن رات ـــــ

لیکن آج اس سڑک کا خوبصورت اور دلکش سینہ چیرا جا رہا ہے۔ مزدور کدال چلا رہے ہیں۔ اس سڑک کو اکھاڑا جا رہا ہے جہاں رات جاگتی ہے اور دن سوتا ہے۔ ایک ایسی رات جس کی کوکھ سے صبح جنم لیتے ہوئے شرماتی ہے ـــــ اس سڑک نے ہمیشہ خوشبو کی لپٹوں کو اپنے جسم سے ٹکراتے دیکھا ہے ـــــ مگر آج یہ سڑک رنگوں کے کلاکار کو دور ایک کونے میں کھڑا دیکھ رہی ہے، ایزل پہ چڑھے کینوس پر خاکہ بناتے ہوئے۔ ویسے تو یہ سڑک زندگی کے کئی حادثوں سے گزری ہے۔ مگر آج کا حادثہ سب سے بڑا ہے۔ بہت ہی بھیانک، کسی شدید زلزلے کی طرح۔ کلاکار سڑک کے سارے زاویے ناپ رہا ہے۔ لیکن اس کا ہر زاویہ گلی کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

چوراہے پر مہک رہے موتیے کے پھول پر جا کے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ موتیے کے پھول کو سڑک اکھڑنے سے پہلے یہاں سے لے جانا چاہتا ہے۔ کلاکار اُسے سمجھاتا ہے:

"یہ مہک سدا نہیں رہتی۔ یہ باغ بہاریں ہمیشہ نہیں رہتیں۔ آ میرے کینوس کے خوشگوار رنگوں میں جذب ہو جا۔ میں تمھارے اندر کی روشنی کو زندہ کر دوں گا۔ میں تمھارے لئے زندگی کی راہ ہموار بنا دوں گا، میں سانپوں کی تیز جیبھیں کھا جاؤں گا۔ میں زہر پی لونگا۔ اور تمھیں دور بہت دور لے جاؤں گا۔ جہاں قابیل اور ہابیل کی کہانی نہ دہرائی جاتی ہو۔ میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے ایک نیا آدم بن جاؤں گا۔ میں قطرہ نچوڑوں گا ——— قطرہ تمھارے اندر ڈھل کر ایک ساگر بن جائے گا ——— ساگر کی پیاس بجھانے کے لئے ہم محنت کریں گے اور محنت کے سہارے جیون کو سُکھی بنائیں گے۔ کیونکہ محنت کا رنگ سب رنگوں سے پکا اور سچا ہے" ——— پر اس کی بات ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ موتیے کا شوخ پھول اسے ہر وقت ایک روکھا سا جواب دیتا ہے:

"میں محنت کروں۔ کام کروں۔ میں کوئی نوکر نہیں۔"

اور ان لفظوں کے معنی، سڑک کی ساری حقیقت کا پتہ دیتے ہیں ——— سڑک کو مٹانے کیلئے بل ڈوزر منگوایا جا رہا ہے۔ بلڈوزر آ رہا ہے۔ ایک شور مچا ہوا ہے۔ لگتا ہے جیسے سڑک جاگ پڑی ہے اور جاگتی سڑک کا شور منھ زور پہاڑی ندیوں کا شور۔ شور... گلیوں کا شور۔ "اس سڑک کو اجاڑا نہیں جا سکتا۔ ہم جمہوری ملک کے باسی ہیں سب سے بڑے جمہوری دیش کے۔ یہ سڑک ہماری زندگی ہے، ہماری زندگی کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اجاڑا نہیں جا سکتا۔

آوازوں کا شور پھیلتا جا رہا ہے۔ شور نے کلاکار کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ شور سے اس کے کان پھٹنے لگے ہیں۔ ان سے لہو رِسنے لگا ہے۔ اسکی آتما بھی لہولہان ہو گئی ہے اور لہو... قطرہ قطرہ، کینوس پر گرنے لگا ہے۔ کینوس تار تار ہو گیا ہے۔ بھیانک شور نے ایزل کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ رنگ بکھر رہے ہیں ——— اور وہ ایک نیا آدمی۔ اکیلا آدمی۔ رنگوں کو بکھرتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو وہاں سے اٹھائے چل پڑتا ہے۔ وہ چل رہا ہے۔ لانبے لانبے ڈگ بھرتے ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ساری کائنات چل رہی ہے۔ پہاڑ، جنگل، میدان، ہوا، پانی سب چل رہے ہیں۔ وہ سب کو پھلانگتا جا رہا ہے۔ وہ تھکا نہیں ہے۔ وہ چلتا ہی جا رہا ہے ——— اور آخر چلتے چلتے دور افق پر کانپ رہے ایک نقطہ کی صورت اختیار کر گیا ہے ———

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کارِ جہاں دراز ہے

یاجوج ماجوج کے بسائے ہوئے ملکِ عدن کا دستور تھا کہ جب بادشاہ سلامت سلامتی سے حکومت کرتے کے بعد عدم کو تشریف لے جاتے تو ان کا جانشین اسے بنایا جاتا کہ اگلے روز جس کے سر پر سب سے پہلے "ہُما" کا سایہ رونق افروز ہوتا۔ بادشاہ کے مرتے ہی ہزاروں لوگ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتے اور خداوند عزوجل سے نہایت عاجزی وانکساری سے دعا کرتے کہ اے دوجہاں کے اصلی مالک ومختار ہما کو ہمارے سر پہ ڈال تاکہ ہم بھی تیری بخشی ہوئی زمین پر چند روز حکومت کر کے بہارِ باغ دنیا دیکھ لیں۔ ہزاروں آوازیں خدائی مائیکرو ویو سسٹم کے ذریعہ دوجہاں کے والی تک پہونچتیں۔ یزداں اپنی بنائی ہوئی مخلوق کی تابعداری ومحکومی پر خوش ہوتا اور کسی ایک خوش بخت پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دیتا۔

ایک بار جب ملک عدن کا بادشاہ خاک میں سما گیا تو سبھی باشندگانِ عدن اپنی خوش بختی کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔ ایک بڑے محل کے اندر بیٹھا ایک مالدار تاجر جائے نماز پر بیٹھا خداوند کریم سے دُعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ! کل صبح سب سے پہلے ہما کو میرے سر پہ سایہ فگن کر اور مجھے بادشاہ بنا دے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اگر ایسا ہوا تو میں اس ملک میں امن وسلامتی قائم کروں گا۔ کسی کو تکلیف نہیں دوں گا۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف کروں گا۔ ملک کو خوش حال بنا دوں گا۔ قوم کو ہر طرح سے خوش رکھونگا۔"

یہ سنکر تاجر کا غلام جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اپنے آقا سے کہنے لگا " آقا! اگر جاں بخشی ہو تو میں بھی ایک دعا مانگنا چاہتا ہوں "۔۔۔ آقا نے جب اجازت دے دی تو اس نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور کہنے لگا:

" خداوندِ برحق! اگر کل صبح سب سے پہلے ہما میرے سر پر سایہ ڈال دے اور میں بادشاہ بن جاؤں تو میں قوم پر اتنا ظلم کروں گا کہ چنگیز و ہلاکو کی روحیں شرما جائیں۔ میری حکومت میں بربریت کا وہ ننگا ناچ ہو گا کہ میرے ملک کی آنے والی سینکڑوں نسلیں میرا نام سنکر کانپ کانپ جایا کریں گی۔ میں ظلم اور عیاشی کو اپنا مقصد بناؤں گا۔ میرے اللہ! میری دعا قبول کر اور مجھے صرف ایک بار اس ملک کا بادشاہ بنا دے۔"

صدقے خدا کی بے نیازی کے کہ اس نے غلام کی سن لی۔۔۔ اگلی صبح ہما کا سایہ اس کے سر مبارک پر جلوہ نما ہوا اور وہ اس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ بادشاہ بنتے ہی اس نے اپنے رب جلیل سے کئے گئے وعدہ کو نبھایا اور قوم پر وہ ظلم کئے کہ الامان والحفیظ ۔۔۔ اس نے پوری قوم کو الٹی چھری سے حلال کیا۔ کسی بہو بیٹی کی عزت سلامت نہ رہی۔ بادشاہ کے خلاف ایک لفظ بولنے پر سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔ لوہے کی گرم سلاخیں، کوڑے، جیل اور گولیاں قوم کا نصیب ہو گئیں ۔۔۔ آخر جب عوام میں قوتِ برداشت نہ رہی تو ان کے چند نمائندوں نے بادشاہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔۔۔ انھوں نے اپنے وفد کی سربراہی کے لئے اُسی تاجر کو چُنا کہ جس کے پاس بادشاہ کبھی غلام ہوا کرتا تھا۔

جب تاجر وفد کو لے کر بادشاہ کے محل میں پہونچا تو بادشاہ سلامت نے صرف وفد کے سربراہ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ جب تاجر بادشاہ کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ اپنے آقا کو دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ اپنے آقا کی تعظیم میں تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا:

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

" میرے آقا ! آپ نے آج کیسے قصرِ شاہی میں آنے کی تکلیف گوارہ کی ؟"

آقا نے جب عوام کی حالتِ زار بیان کی اور اُسے ظلم بند کرنے کی تلقین کی تو بادشاہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا :

" آقا ! وہ دن یاد کرو جب میں آپ کا غلام ہوا کرتا تھا۔ ایک دن آپ نے اور میں نے ایک ہی جگہ پر بیٹھے خدا سے الگ الگ دعا کی تھی —— آقا! آپ نے فرمایا تھا کہ اگر آپ بادشاہ بن گئے تو قوم کا دامن خوشیوں سے بھر دینگے اور میں نے کہا تھا کہ اگر میں بادشاہ بن گیا تو میں قوم پر اتنے ظلم کرونگا کہ چنگیز و ہلاکو کی سرکش روحیں شرما جائیں —— آقا ! پروردگار نے میری دعا قبول کی تھی، آپ کی نہیں —— لہذا میں تو صرف اپنے خدا سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا ہوں —— اور یہ سن کر آقا اپنا سا منھ لے کر قصرِ شاہی سے باہر آگیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

رُوحیں

آج کے اخبار کی سُرخی کل میں نے خُود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ کل میری آنکھوں کے سامنے ایک لاش کا قتل ہوا تھا۔ لاش ـــــ جو ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کر کے آرہی تھی ـــــ تقریر ـــــ قومی یک جہتی اور ملکی سالمیت کے موضوع پر ـــــ انتہا پسندی سے پھیلتی تباہی کے بارے میں ـــــ تقریر بڑی جاندار اور شاندار تھی۔ تالیوں سے سارا ہال گونج اٹھا تھا۔ تعریف کرتے کرتے لوگوں کے منہ سوکھ گئے تھے۔ لفظوں کے جادو نے سب کو باندھ کر رکھ دیا تھا۔ ڈھیر سی مبارک باد اپنی جیبوں میں ڈالے لاش کار میں اپنے گھر آرہی تھی کہ اس بڑے چوک میں زندگی نے پل بھر کے لئے اسے جھنجوڑا اور پھر ہمیشہ کے لئے موت کے ہاتھوں میں پھینک دیا۔ لاش کو مرتے ہوئے اور بھی کئی آنکھوں نے دیکھا تھا لیکن وہ سب اندھی تھیں اس لئے لاش کو کیسے بچا سکتی تھیں۔ لیکن وہاں ایک قتل اور بھی ہوا تھا قتل ـــــ ایک روح کا ـــــ لیکن رُوح کا قتل اخباروں کی سرخی نہ بن سکا ـــــ روح ـــــ جو دودھ سے بھری گاگریں گوکل سے شہر لے جا رہی تھی تاکہ میٹھے دودھ سے میلے دلوں کو دھویا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جاسکے . گندے لہو کو صاف کیا جاسکے اور رگوں میں پریم رس گھولا جاسکے . روح نے جب لاش کو موت کے ہاتھوں میں تڑپتے دیکھا تو کانپ گئی اور اسے بچانے کے لئے گرم وحشی ہواؤں کو روکنے لگی ـــــ آگ کو پکڑنے لگی اور آخرکار خود بھی قتل ہوگئی ۔

آج اخباروں کی سرخی پڑھ کر لاش کی ارتھی کے جلوس میں ہزاروں اندھے چل رہے تھے شمشان بھومی میں ٹیلی ویژن کیمروں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں . تماشہ دور درشن پر دکھانے کے لئے کیمرے چل رہے تھے . ان کی آنکھوں میں بڑی کشش تھی ، بڑی طاقت تھی . وہ رنگ برنگے اشتہاروں کو چن چن کر فوکس کر رہے تھے . عقیدت مند پھولوں کے ہار لئے منتظر تھے کہ ارتھی کو شردھا کے پھول ارپن کئے جاسکیں . پھر کیمروں کی آنکھوں نے دیکھا کہ دو ارتھیاں الگ الگ راستوں سے شمشان بھومی میں داخل ہوئیں . ایک ارتھی کاروں ، سکوٹروں ، موٹرسائیکلوں کے جلوس میں سجا کر سرکاری اعزاز کے ساتھ لائی جارہی تھی جبکہ دوسری ارتھی کو صرف چار روحیں کندھا دیکر شمشان میں لا رہی تھیں .

لاش کو سرکاری اعزاز کے ساتھ چتا میں رکھا گیا . فلیش گنوں کی چکا چوند نے سارے ماحول کو روشن کردیا . نیتا لوگ ارتھی پر پھولوں کے ہار رکھتے جارہے تھے . وہ بڑے دکھی چہروں کے ساتھ فوٹو کھنچوا رہے تھے اور خراج عقیدت پیش کر رہے تھے تاکہ اگلے دن کے اخباروں کی سرخیوں پر قبضہ جاسکیں ـــــ مگر ـــــ دوسری ارتھی کی طرف ایک پھول بھی نہیں پھینکا گیا . کسی بھی کیمرے کی آنکھ نے اس کی جانب نہیں دیکھا ـــــ کوئی بھی اس کے قریب نہیں گیا .

چتا کے آگ پکڑنے کے ساتھ ہی سبھی اندھے اپنی اپنی کاروں ، سکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر گونگے محلوں میں جاچھپے تاکہ بے حس جسموں کو وحشی گرم ہواؤں سے بچایا جاسکے . لاش چتا میں جلتی رہی . ڈوم دیکھتا رہا . جب شمشان بھومی سے زہریلی آوازوں والی چمگادڑیں اڑگئیں تو ڈوم نے ایک چتا اور بنائی . چاروں روحوں نے قتل ہوئی روح کو چتا پر رکھا . ایک روح نے چتا کو آگ دکھائی . آگ پھیلنے لگی ، شعلوں میں تبدیل ہوئی اور چاروں روحیں مقتول روح کو جلتے دیکھنے لگیں . آگ کے شعلوں میں روح پر لپٹا ہوا کفن جلا . روحیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دیکھتی رہیں۔ وہ منتظر تھیں کہ کب چتا کی آگ ٹھنڈی ہو اور وہ واپس جائیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد آگ ٹھنڈی ہوئی۔ چاروں روحیں جانے لگیں۔ لیکن ایک آواز نے انھیں چونکا دیا ——— انھوں نے پیچھے مڑکے دیکھا ——— راکھ کے ڈھیر میں سے روح زندہ سلامت باہر نکل آئی تھی اور ہنستے ہنستے کہہ رہی تھی:۔

"بھلا روح بھی کبھی مری ہے، روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے، روح کبھی نہیں مرتی۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دُشمنی

مجھے پھولوں کی وادی میں پہنچنے کی بڑی تمنا تھی۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ میں خوبصورت وادی میں جلد از جلد پہنچنے کے لئے دشوار راستوں کو پھلانگنے لگا۔ منزل جب تھوڑی دور رہ گئی اور وادی بالکل سامنے دکھائی دینے لگی تو مجھے ایک اور مسافر راستے میں سویا ہوا مِلا میں نے اسے جگایا اور اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تاکہ خوبصورتی کا نظارہ اکھٹے مل کر کر سکیں۔ لیکن وہ میرا راستہ روک کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "پھولوں کی وادی پر صرف میرا حق ہے۔ وہاں اور کوئی نہیں جا سکتا۔"

میں نے خود کو اس سے چھڑایا اور اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ ہی قدم چلا تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا میں درد سے بے حال ہو گیا۔ وہ میرے پاس آ کر خوب ہنسا اور بولا؛

"تمھارے راستے میں کانٹے میں نے بچھائے ہیں تم مجھ سے آگے نہیں جا سکتے۔ خوبصورت وادی میری ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے آگے نکل گیا۔

مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے پاؤں سے کانٹا نکالا اور دوڑتا دوڑتا اس سے بہت آگے نکل گیا۔ پھر میں نے بھی اس کے راستے میں کانٹے بچھا دئے۔ اس کے پاؤں میں بھی کانٹا چبھا۔ اس طرح یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا اور ہم دونوں ہی پھولوں کی وادی میں نہیں پہنچ سکے کیونکہ —— ہماری زندگی کے پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گھاس پر چلنا منع ہے

میرا نام رانو ہے۔ میں اِس اُجاڑ باغ کی مالن تھی۔ میں نے اِس باغ کو سنوارنے اور شنگھارنے میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی وقت یہ باغ اپنی خوبصورتی کے لئے دوُر دوُر تک مشہور تھا۔ میں نے اِس باغ کی ہری گھاس پر چلنے والوں کو کبھی نہیں روکا۔ کیونکہ صبح کے وقت شبنم سے نہائی ہوئی مخملی گھاس پر ننگے پاؤں چلنا صحت کے لئے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ننگا جسم تازہ گھاس پر رینگنے لگے تو اس میں ایک اپنا سُرور ہے ــــ ایک انوکھی لذت ہے ــــ کم سے کم میرا تجربہ یہی کہتا ہے ــــ خیر یہ پرانی باتیں ہیں ــــ ماضی کی یادیں ہیں۔ لیکن یادوں کو کبھی کبھی تازہ کرلیا جائے تو برا کیا ہے۔

میرے باغ کے باہر ایک گل مہر کا درخت لگا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمیشہ کے لئے میرے باغ کے اندر آجائے اور اس کی خوبصورتی کو بڑھائے۔ مگر گل مہر کی جڑیں، رسموں اور رواجوں کی کالی مٹی سے بھری دھرتی میں بہت اندر تک دھنسی ہوئی تھیں ــــ میرے لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ اس کالی مٹی میں سے اکھڑ سکا اور میرے باغ کی رونق نہیں بن سکا ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پر کبھی کبھار ہُوا کے کسی تیز جھونکے کے ساتھ وہ میرے باغ کے اندر ضرور جھانک لیتا۔
آج اس گل مہر کا وجود مجھے کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ کیا خبر زندگی کے اس صحرا میں آج وہ ٹھوکریں کھا رہا ہوگا یا اپنے لال لال پھولوں سے کسی بلوری شیشوں والے گھر کو حُسن بخش رہا ہوگا۔ یا اللہ جانے وہ ہرا بھی ہوگا یا میری طرح سیاہ بختی کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ سیاہ بختی میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ____ ہاں! میں بات تو اپنے باغ کی کر رہی ہوں لیکن اس باغ کے ساتھ گُل مہر کی بات بھی جڑتی ہے۔ اور وہ یوں کہ جب میرے باغ کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں تو سب سے پہلے گل مہر نے ہی مجھے میرے باغ کی سُندرتا کا احساس دلایا تھا۔ ان دنوں وہ اکثر میرے باغ کی چار دیواری کے اندر جھانکتا رہتا۔ بڑی دلکش نظروں سے۔ میرا کھل رہا باغ لہرانے لگتا ____ میرے باغ کی کنواری گھاس گُل مہر کو گلے لگانے کے لئے بے تاب رہنے لگی۔ میں اس کے پھولوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے مچلنے لگی۔ پانی آگ کے پاس رہے تو وہ کبھی نہ کبھی اُبلنے لگ جاتا ہے۔ آگ اور پانی کی اس کشمکش میں آخر ایک دن وہ میرے باغ کے اندر آگیا۔ اور میری شاداب مخملی گھاس پر رینگنے لگا۔ مجھے پہلی بار، اُس کا گھاس پر رینگنا بہت اچھا لگا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ زندگی بھر میرے باغ کی گھاس پر رینگتا رہے اور ہمیشہ کے لئے اس کا مالک بن جائے لیکن گل مہر تو میرے باغ پر بچّہ سقا کی طرح صرف اڑھائی دن کا راج کرنا چاہتا تھا اور یہ بات مجھے منظور نہ تھی ____ میں نے ایک ایسی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا، جس کی زندگی کے چولہے میں سدا حسرتوں اور تمناؤں کی لکڑی ہی جلتی رہی۔ اس کی حسرتوں کا کشکول بیچ بازار ٹوٹا تھا۔ اور دھیرے دھیرے وہ بازار میں ٹوٹنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ایک ٹکسال بن گئی۔ ایک ایسی ٹکسال جس میں ڈھلا ہوا ہر سکّہ مختلف ہوتا۔ پھر ٹکسال سکّے ڈھال ڈھال کر تھک گئی۔ وہ گِھس گئی اور ختم ہو گئی ____ گُل مہر مجھے ہمیشہ اس بات کا طعنہ دیتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بات کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے۔ خاص کر اُس کی بات کا...... جسے کوئی اپنا سمجھے۔ پر یہاں تو اپنے ہی دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے ہی تو باتیں کرتے ہیں۔ یہاں، اپنی آنکھ کا شہتیر کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر دوسروں کی آنکھ کا تنکا سب کو

دکھائی دیتا ہے ـــــ میں بھی عیبوں کی قتل گاہ پر قربان کر دی گئی۔ میری روح اداس ہوگئی۔ میرا دل پریشان رہنے لگا۔ میں اکثر یہ گیت گنگناتی رہتی۔

گڈّی کٹ جاندی جنہاں دی پریم والی

مُنڈے لے جاندے اوہناں دی ڈور لُٹ کے

لیکن میں نے تو اپنے باغ کے حُسن کی ڈور کو گُل مہر کے ہاتھوں خود لٹوایا تھا۔ میری زندگی میں وہ سب سے پہلا حادثہ تھا ـــــ پر جو حادثہ ایک بار ہو جائے وہ چاہے پھر سو بار دُھرایا جائے...... تو کوئی فرق نہیں پڑتا ـــــ

گل مہر مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ نہ جانے کہاں گُم ہو گیا۔ اس کی گمشدگی کے بعد میں وہ کنواری بن گئی جس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا شریر اَن چھُوا ہے...... پاک، صاف اور مقدس ہے۔ پھر میرے چاند کو داغ لگتے رہے۔ میری چاندنی میلی ہوتی رہی ـــــ اور میں رفتہ رفتہ کسی نوچی کی طرح بے قابو ہو گئی۔ میں سڑک پر لگا ہوا ایک ایسا نلکہ بن گئی کہ جس کا جی کرتا پیاس بجھا لیتا۔ میں نے کبھی کسی کو نہیں روکا۔ پیاسے لوگ اپنی پیاس بجھاتے رہتے اور میں انکی جیبیں ہلکی کرتی رہتی ـــــ جیبیں ہلکی ہوتی رہیں...... ...... میرے باغ میں نکھار آتا گیا۔ رنگ برنگے پھولوں کی مہک میرے باغ کو مست بنانے لگی۔ کھلی ہواؤں کی مستی من پنچھی کو اُڑنے کے لئے اُکسانے لگی ـــــ روشنیوں کی چمک ـــــ میرے ذہن کا در کھٹکھٹانے لگی۔ میرے باغ کے سبز پتے میری پیلی سوچ میں گم ہو گئے میں نئے زمانے کے رستوں پر چلنے لگی اور...... گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے لگی۔ میرے سامنے کئی قصبوں کی مسی ہوئی۔ کئی الھڑ دوشیزاؤں کی نتھنی کھُلی۔ شہروں کی بے پناہ بھیڑ میں میرے باغ کے پھول خوب کھِلے۔ بڑی رونقیں رہتیں۔ دولے شاہ کے چوہے میری مُرادیں بر لاتے۔ کام دیوتے میرے باغ کا طواف کرتے۔ میں نئے زمانے کے سبھی گُر سیکھ گئی تھی میرا کاروبار جوبن پر تھا۔ میں دیوتاؤں کی بھوک مٹاتی۔ ان کے جسموں کی آگ بجھاتی۔ کیونکہ اُس دنیا میں جسموں کی آگ بجھانا شرافت اور ایمانداری کا عمل سمجھا جاتا تھا۔ میرے باغ کے اندر وہ جانور روز جگالی کرتے جنہیں بیگانی کھُرلی کا چارا مزے دار لگتا۔ روز

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کوئی مجھے ڈھونڈتا اور کبھی میں کسی کو ...اسی طرح زندگی کے دن گزر رہے تھے۔۔۔
میں خوش تھی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں خوش رہنا اچھے اخلاق کا ثبوت تھا۔ میرے باغ
میں کئی بھونرے آئے۔ پر جو لذت اور خوشی میرے باغ کو گل مہر کے ملاپ سے ملی تھی۔
وہ پھر جیون بھر نہیں ملی۔ اس ایک پل کو پکڑنے کی آس میں، میں بہت بھٹکی۔ میں خود
سدا پیاسی رہی لیکن غیروں کی پیاس بجھاتی رہی۔ ان کی میٹھی باتوں کے فریب کھاتی رہی۔
کوئی میرے باغ کی خوبصورتی کی تعریف کرتا۔ مجھ سے پیار کا اقرار کرتا..... تو مجھے اچھا لگتا۔
ایسی باتیں روز ہوتیں ۔۔۔ میں سمجھتی تھی کہ پریم کے میٹھے بول میرے درد کا علاج ہیں....
....پر میرا مرض لاعلاج تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آگیا جب میں اس چور سپاہی کے کھیل کو فضول سمجھنے لگی۔
میرے یوں سمجھنے میں میرا باغ بھی ساتھ دے رہا تھا۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ اپنا آپ
کسی کے حوالے کر دیں۔ لیکن، ہمیں ویسا کوئی ملا نہیں۔ میرے حُسن کے بامِ عروج نے میرے
زوال کو جنم دے دیا تھا اور میرا باغ میرے زوال کے حدود میں داخل ہونے کی تیاری
کرنے لگا۔۔۔ میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرا باغ اتنی جلدی محرم کے کالے کپڑے پہن
لے گا۔ پت جھڑ کا موسم یوں دوڑتا ہوا آجائے گا۔ پت جھڑ کا موسم۔ خالی خالی، ویران، بدشکل
.....پت جھڑ کا موسم، محرم کا ماتم، صدیوں کا غم، اب زندگی، دُکھوں، تکلیفوں، تنگیوں اور فکروں
میں غرق رہنے لگی۔ کئی بار موت......میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورنے لگتی۔ میں ڈر جاتی
میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن زندگی کے رنگ بھی تو پھیکے پڑ رہے تھے۔ میرے باغ پر زوال
کیا شروع ہوا، سب یار دلدار پکھیروؤں کی طرح اُڑ گئے۔ میرا کوئی نہ بنا۔ غم کی پگڈنڈی نے مجھے
تھکا دِیا۔ اندیشوں اور فکروں کی دُھند پھیلتی گئی۔۔۔ اور یوں ہی جانے کتنی صدیاں بیت
گئیں۔۔۔ پھر آسمان پر ایک کہرام مچا۔ کالے بادل گرجنے لگے اور زور سے برسنے لگے۔ بجلی
کی کڑک سے بادلوں کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہونے لگے۔ دھند صاف ہو تی گئی۔ آسمان
ایک بار پھر ہنسنے لگا۔ سورج نے اپنا روپ دِکھایا اور مجھے لگا جیسے بادل میرے باغ کی
ساری غلاظت دھو کر لے گئے ہیں۔ جیسے میرے باغ کو لگا گہن ختم ہو گیا ہے۔ میری اندھی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

آنکھوں میں روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور مجھے دُور ہنستے آسمان میں گُل مہر کا وجود دکھائی دینے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ میرا باغ گل مہر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ ایک بار پھر لہرانے لگا۔ گل مہر نزدیک آتا گیا اور آتے آتے میرے باغ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اُس نے میرے ساتھ تو کوئی بات نہیں کی لیکن میرے باغ کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ریتلی زمین سے اکھاڑا اور میرے باغ کے اندر آگیا۔ وہ اندر آتے ہی میرے باغ کے پیلے پتے چُننے لگا۔ دوبارہ ہریالی لانے کی ناکام کوشش میں وہ سارے باغ کی گڈائی کرنے لگا۔ سوکھے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دینے لگا ــــ اس نے باغ کے چاروں طرف ایک لکھشمن ریکھا کھینچی ــــ اور لکھشمن ریکھا کے باہر ایک بڑا بورڈ لٹکا دیا ــــ بورڈ پر موٹے لفظوں سے لکھا ــــ گھاس پر چلنا منع ہے ــــ.

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بابا ٹکی

فرنگی محلّے کی چھوٹی مسجد کے متصل برگد والے چوراہے کے نزدیک بابا ٹکی کی دوکان ہوا کرتی تھی۔ دوکان اچھی خاصی مگر اندر مال بہت کم۔ بس بچوں کے لئے ٹکیاں، اِملی، پاپڑ، چنے، مونگ پھلی، دال سوئیاں، بانٹے، کلفیاں ــــ یا پھر کریانے کا چھوٹا موٹا سامان۔ گرمیوں کے دنوں میں ــ برف، سوڈے کی بوتلیں، گوند کتیرا، تخمِ بلنگاں کا شربت اور بابا ٹکی کی پتلی آواز ــــ "پیئو تے جیو۔"

یہ دوکان بابا ٹکی کے بڑے بھائی بابا حاکم نے کھولی تھی ــــ اُن دنوں چودھری حاکم دین کے بڑے ٹھاٹھ ہوا کرتے تھے۔ محکم دین المعروف بابا ٹکی ان دنوں حاکم دین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ حاکم دوکان پر بیٹھتا، سودا سلف بیچتا اور ساتھ ساتھ بہت کچھ خرید بھی لیتا اور محکم دین بیچارہ اپنے بڑے بھائی کی خاطر پانڈیوں کا کام کرتا ــــ دوکان کے لئے سارا سامان لاتا، اسے سلیقے سے سجاتا، چیزیں تول تول کر گاہکوں کو دیتا اور وقت بے وقت اپنے بڑے بھائی سے موٹی اور پتلی، باسی اور تازہ گالیاں بھی کھاتا ــــ گالیوں کا نشاستہ کھا کھا کر محکم دین کا خمیر سیر ہونے لگا، اس کی رگیں اکڑنے لگیں، اسے بدہضمی ہونے لگی اور حاکم دین کا گھر ایک قبر کی مانند معلوم ہونے لگا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جس میں اس کی زندگی دفن ہوتی جارہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح دفن نہیں ہونے دینا چاہتا تھا وہ تو سورج کی روشنی کی طرح آزاد رہنا چاہتا تھا، —— آخر ایک دن وہ اپنے بڑے بھائی کو اکیلا چھوڑ کر امرتسر چلا گیا۔ وہاں جاکر اس نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کیا اور پانڈیوں کا کام کرنے لگا۔ تین چار سال میں اس نے پانچ چھ ہزار روپے بھی جمع کر لئے تھے۔ وہ خوش تھا مگر کبھی کبھی اسے اس خوشی میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی۔ جوانی کا خمار اسے کھٹے میٹھے سپنے دکھاتا۔ پیسے دیکھ کر اسے شِدّت کی پیاس لگتی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایک پیاسا شخص سپنوں کے چشموں سے پیاس نہیں بُجھا سکتا —— اور پھر ایک دن اسے بیٹھے بیٹھے ہی خیال آیا کہ اسے شادی کر لینی چاہیئے تاکہ زندگی کی گاڑی کو دوسرا پہیہ مل جائے۔

امرتسر میں وہ پُتلی گھر کے قریب جولاہوں کی بستی میں رہتا تھا۔ اس بستی میں رمضان ٹانگے والے کی حسین اور اَلھڑ دوشیزہ جمیلہ پر اس کا دل آگیا۔ ایک دن اس نے اپنی مکان مالکن مائی بیگو کے ساتھ جمیلہ کا ذکر چھیڑا اور اسے رمضان ٹانگے والے کے گھر رشتہ مانگنے بھیجا۔ پہلے تو رمضان اور اس کے رشتہ دار محکم دین کی ذات برادری کے بارے میں پوچھنے لگے، والدین کا اتا پتہ تلاش کرنے لگے۔ مگر جب بیچ والوں نے بتایا کہ محکم دین اکیلی جان ہے تو وہ رشتہ دینے کے لئے جلدی رضامند ہو گئے —— محکم دین نے ابٹن ملا، کھارے بیٹھا، موتیے کے پھولوں کا سہرا باندھا، بینڈ باجے بجے، بھنگڑا ہوا، دل کے ارمان پورے کئے —— نکاح ہوا اور محکم دین جمیلہ کو بیاہ کے لے آیا۔ جمیلہ سچ مچ بہت حسین تھی۔ چھل چھل کرتا شباب ڈھلک رہا تھا۔ جمیلہ کو دیکھ کر محکم دین لہرا اٹھا۔ اس کے من میں خوشیوں کے پھوارے چھوٹنے لگے۔ اس کی مرادیں پوری ہوئی تھیں۔ ولیمے والی رات کو محکم دین نے اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کیں۔ آنے والی زندگی کے بارے میں، اپنے ایک چھوٹے سے گھر کے بارے میں، ہونے والے بچوں کے بارے میں —— وہ ساری رات جمیلہ کو یقین دلاتا رہا کہ وہ اسے عمر بھر خوش رکھیگا۔

جمیلہ کو محکم دین کی فضول باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اس نے محکم دین کو دھوبی پٹرا مار کر لٹا لیا —— مگر کچھ ہی لمحات میں وہ محکم دین کے لنگوٹ کی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

حقیقت جان گئی اور پیچ و تاب کھا کر سو گئی ـــــ دوسری رات جمیلہ کو اس کا لنگوٹ پہلی رات سے بھی ڈھیلا معلوم ہوا ـــــ وہ اپنے باپ رمضان کے گھوڑے کی کئی بیماریوں کا علاج خود ہی کیا کرتی تھی، اس نے محکم دین کا بھی ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح معائینہ کیا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ محکم دین اللہ کی بخشی ہوئی کوئی تیسری شے بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ حیران تھی کہ گھوڑا اپنے پاؤں پر کیوں کھڑا نہیں ہوتا ـــــ جمیلہ نے محکم دین کو چنے کی کچی دال دودھ میں بھگو کر پلائی، دودھ میں ہی گری، چھوہارے اور بادام ابال کر پلائے۔ سلاجیت کھلائی، چڑیوں اور کبوتروں کا گوشت دیسی گھی میں بھون بھون کر کھلایا، چوزوں کا شوربا پلایا۔ کبورے تل تل کر دئے، مالش کی، کُشتے کھلائے، انجکشن لگوائے۔ غرض ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں کے سارے نسخے آزمائے مگر محکم دین کی "صحت" میں کوئی فرق نہیں پڑا، پڑتا بھی کیسے، اسے تو آبِ نزول اور ذکاوتِ حس کی بیماری تھی، وہ دوا دارو کی بیساکھیوں کے سہارے کچھ لمحے تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا لیکن دو قدم چلتے ہی گر پڑتا ـــــ جمیلہ نے محکم دین کے ساتھ جتنے بھی دن گزارے، وہ بیچاری تو ایڑیاں کھرچتی ہی رہ گئی مگر اسے پازیبیں نہیں ملیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ محکم دین کے ساتھ چل کر وہ کبھی بھی منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ آخر کار وہ محکم دین کو راستے ہی میں چھوڑ گئی۔ وہ ساگر کی جوشیلی لہروں کو شانت کرنے کی خاطر اُبلتے پانیوں پر دوڑنے لگی، ہواؤں میں اڑنے لگی اور آخر کو توالی کے سپاہی گل زماں کے گھر ٹھنڈی ہو کر بیٹھ رہی ـــــ محکم دین پھر تنہا رہ گیا۔ اداس ـــ پژمردہ، وہ چاہتا کہ جی بھر کر روئے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ٹوٹے دل کبھی بھی آنسوؤں کی گوند سے نہیں جُڑتے ـــــ ایسے حالات میں اُسے اپنا بھائی یاد آیا ـــــ اور وہ لوٹ کر حاکم دین کے پاس آ گیا، گالیوں کا نشاستہ کھانے۔ لیکن گالیاں ـــــ اب حاکم دین کے اندر ہی جذب ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کا سارا وجود بکھر رہا تھا اور آخر میں اسے گلے کا کینسر کھا گیا۔ حاکم دین کے انتقال کے بعد محکم دین اس کی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کا مالک بن گیا۔ کیونکہ حاکم دین کی بنجر زمین سے کوئی فصل نہیں اُگی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تھی۔ حاکم دین نے زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے بہتیرے جتن کئے تھے لیکن قدرت کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔ حاکم دین کی منقولہ جائداد میں سے محکم دین کو ایک عدد بھابھی بھی ملی تھی جس کا اب اس دنیا میں سوائے محکم دین کے کوئی اور نہ تھا۔ ویسے تو محکم دین کی بھابھی جوانی میں بڑی رنگیلی طبیعت کی مالک تھی لیکن چودھری حاکم دین کی زندگی میں وہ کبھی لکشمن ریکھا پار نہیں کر سکی تھی۔ حاکم دین کے مرنے کے بعد وہ جلد ہی محکم دین کے بُکّل کی چور بن گئی ——— محکم دین اپنے بڑے بھائی کا جھوٹا برتن چاٹنے لگا ___ اس کی بھابھی کو بھی بُکّل اوڑھتے ہی جمیلہ کی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اس مشین کے پُرزے ڈھیلے ہیں۔ برتن چاٹنے والی انگلی بڑی کمزور ہے۔ لیکن وہ "رَجی پُجی" عورت محکم دین کی ڈھیلی چادر کے نیچے اپنی عُریانی کو ڈھکا ہوا سمجھتی تھی۔ اسی لئے چپ تھی ——— پھر ایک دن جھوٹا برتن ٹوٹ گیا ___ بنجر زمین پاتال کے اندر دھنس گئی ___ محکم دین جی بھر کے رویا۔ اُسے بڑا صدمہ ہوا تھا۔ مگر بھابھی کا چالیسواں کرتے کرتے اس کی اُداسی سے شوخی کے کلّے پھوٹ پڑے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اندھیرے میں ساری بلّیاں ایک ہی رنگ کی ہوتی ہیں اور وہ صرف چوہے کھانے میں ہی دلچسپی رکھتی ہیں — وہ دوبارہ نئی شادی کے چکر میں پڑنے لگا۔ اوپر سے اب وہ عمر کے اُس حصے میں داخل ہو چکا تھا جب شادی کا نام لیتے ہی مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن اسے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ وہ تو اپنے من کی پیاس بجھانا چاہتا تھا، جو کہ اس کے مطابق کبھی نہیں بجھی تھی۔ عورت کے سلسلے میں ایک کمی کا احساس اس کے اندر ہمیشہ زندہ رہا تھا۔ عورت کے ملاپ سے جو لطف ملتا ہے، کلیجے میں جو ٹھنڈک پڑتی ہے ——— وہ ٹھنڈک اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی عورت کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حصول کی خواہش جاگ اٹھتی۔ اس کے من کا مور کسی بھی خوبصورت مورنی کو دیکھ کر ناچنے لگتا۔ رقص کرتے وقت مور کی نظر جب اپنے پیروں کی طرف جاتی ہے تو وہ شرمسار ہو کر رقص بند کر دیتا ہے۔ لیکن محکم دین کے من کا مور اپنے پیروں کی طرف دیکھ کر بھی شرمندہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اپنے پیروں کو خوبصورت اور مضبوط سمجھتا تھا۔ اُسے جمیلہ اور بھابھی کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دن رات کے طعنے بھول گئے تھے اُسے اپنی بیماری کا کوئی دھیان نہ تھا جو دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔

جوں جوں محکم دین کی عمر کے گھونسلے میں وقت ایک ایک تنکا بڑھاتا جاتا تھا اس کے من کی بے قراری بھی بڑھتی جاتی ـــــ درخت چاہے کتنا ہی بوڑھا ہو جائے ـ زندگی کی کتنی ہی بہاریں کیوں نہ دیکھ لے۔ پھر بھی نئی بہار دیکھنے کی آس نہیں چھوڑتا۔ لیکن جس نے اپنی مرضی سے بہار کو کبھی بھی برتا نہ ہو۔ اُس کی آس کی شدّت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں ـــــ محکم دین کی جوان خواہش اس کے چہرے پر جھُریاں لے آئی تھیں اس کے سر میں چاندی چمکنے لگی تھی لیکن پھر بھی وہ شادی کرنے کے لئے تیار رہتا ـــــ آہستہ آہستہ فرنگی محلے کے گامے ماجھوں کو محکم دین کی ساری صفات کا پتہ چل گیا۔ وہ اسے چھیڑنے لگے، اس کے ساتھ مذاق کرنے لگے۔ اُس کے نام دھرنے لگے۔ پاپڑ املی اور رنگ برنگی ٹکیاں بیچنے کی وجہ سے اُس کا نام بابا ٹکی مشہور ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں محکم دین اپنا نیا نام سنتے ہی آگ بگولہ ہو جاتا ـــ بابا ٹکی کہنے والوں کے پیچھے پڑ جاتا۔ گالیاں دیتا، پتھر مارتا ـــ پھر آہستہ آہستہ وہ اس نئے نام کا عادی ہو گیا اسے اس نام میں اپنا پن دکھائی دینے لگا تھا۔ جب کوئی چھوٹا بچہ پانچ دس پیسے خرچنے کے لئے محکم دین کی دوکان پر آتا اور اسے اپنی توتلی زبان میں "بابا ٹکّی" کہتا تب اسے بہت اچھا لگتا، اس کے اندر پیار جاگ اٹھتا وہ اس بچے کو گلے سے لپٹا لیتا اس سے پیار کرتا اور پھر دُور تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا، بعد میں ٹھنڈی آہ بھر کر بہت دیر تک سوچ کے گہرے کنویں میں ڈوبا رہتا۔ کنویں سے باہر نکلتے ہی وہ طوفانی لہروں میں غوطے کھانے لگتا اور زور زور سے بولنے لگتا ـــــ "میں شادی کروں گا، میری شادی کراؤ" ـــــ

عمر کی گٹھڑی بھاری ہونے کے باوجود اس کے شوق میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا لُچے لفنگے اس کے ساتھ دوستی لگاتے رہتے، اس کو سبز باغ دکھاتے رہتے اور اس کا مال ہضم کر کے اس کا مذاق اُڑاتے رہتے ـــ بابا ٹکّی لوگوں کے لئے تو ہنسنے کھیلنے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کا ایک کھلونا بن گیا تھا۔ مگر ہنسی اور قہقہے اس کے دل میں تیر بن کر چبھتے ـــــ لوگوں کا وطیرہ دیکھ کر اس کے دل کا کھلونا چور چور ہو جاتا، اس کا چہرہ درد کی تصویر بن جاتا، وہ جلتا کڑھتا رہتا لیکن کسی سے کچھ نہ کہتا۔

ایک دن بابا ٹکی دکان کے اندر سودا بیچتے بیچتے بے ہوش ہو گیا، لوگ دوڑے، اس کو پانی پلایا، سر اور پاؤں کی مالش کی۔ جب وہ ذرا سا ہوش میں آیا تب درد سے کراہنے لگا، جلدی ہی اسے ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر معاینہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے خصیوں کا کینسر ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق کینسر کا یہ مرض اسے بہت پرانا تھا۔ سولہ سترہ برس کی عمر سے ہی اس مرض کے آثار اس کے اندر شروع ہو چکے تھے، مگر وہ حیران تھے کہ محکم دین اتنی دیر کس طرح زندہ رہا۔ ـــــ انھوں نے بابا ٹکی کے خصیوں کا آپریشن کیا، گندا مواد باہر نکالا، سوجن میں ذرا کمی ہوئی، درد میں تھوڑا فرق ہوا ـــــ اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑانے لگا " ـــــ وہ دیکھو ـــــ ایک پری حسین کپڑے پہنے اور گہنوں سے سجی دھجی دور آسمان سے مجھے بلا رہی ہے ـــ اس کے ساتھ بچے بھی ہیں ـــــ گول مٹول ـــــ گورے گورے ـــــ پیارے پیارے ـــــ بچے، اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ـــــ مجھے گڑیوں کا کھیل کھیلنے کے لئے بلا رہے ہیں۔ ـــــ وہ دیکھو، ایک بہت اونچی سیڑھی ہوا میں کھڑی ہے ـــــ مجھے سیڑھی پر چڑھنے دو ـــــ مجھے جانے دو ـــــ مجھے نہ روکو ـــــ " اور بابا ٹکی جھٹ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اور زور زور سے چیخیں مارنے لگا، چلانے لگا ـــــ " میری شادی کراؤ، میری بیوی لاؤ ـــــ مجھے میرے بچوں کے پاس لے چلو ـــــ مجھے میرے گھر لے چلو "۔

کچھ لمحوں کے بعد اس کی آواز مدھم ہو گئی ـــــ پھر آواز گونگی ہو گئی اور آنکھیں آسمان کی جانب جا لگیں ـــــ شاید وہ ہوا میں ٹنگی ہوئی آسمان کی طرف جانے والی سیڑھی پر چڑھ گیا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اپنا دامن اپنی آگ

دُنیا کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے طویل عرصہ ہو گزرا تھا۔ آسمان پر بسنے والا وہ بڑا خاندان کب کا زمین کی نیرنگیوں میں کھو چکا تھا کہ پھر وہی حادثہ ہو گزرا ——— ہاں وہی ——— ہابیل اور قابیل والا۔ پھر ایک لڑکی طبقاتی جنگ کا باعث بننے لگی۔ لڑکی جو ہیلن تھی یا قلوپطرہ ——— سوہنی تھی یا ہیر سسّی تھی یا شیریں ——— اپنے ازلی حق کو استعمال کرتی ہوئی ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہونے کے لئے۔ چاند کی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ لینے کے لئے ——— لڑکی اپنے پیارے سورج کو ہاتھوں میں لئے دوڑ رہی تھی۔ یہ سورج اس نے خود تراشا تھا۔ یہ سورج اس کے گلے کا ہار تھا، اس کے ماتھے کا جھومر ——— اور اس سورج کا نام دشینت تھا۔ وہ دشینت کو کسی بھی حالت میں کسی اور کو سونپنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لڑکی خوبصورت تھی، شوخی اور بانکپن نے اس کے رنگ روپ کو سنوارا تھا۔ گلابی ہونٹوں سے نکلنے والے لفظوں میں بلا کی مٹھاس تھی۔ اس کا جسم خوبصورت شاعری سے مرصع ایک کتاب تھا۔ اس کا مذہب دلنوازی تھا۔ محبت اس کا ایمان تھا۔ اس کے سبھی رشتے محبت سے شروع ہو کر محبت پر ختم ہونے والے تھے۔ عشق کی گرمی نے اس کے وجود کو بجلی بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں باتیں کرنے لگ گئی تھیں۔ زبان نے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ کان بولنے اور ہاتھ سننے لگے تھے۔ یہ سب دشینت کی بدولت تھا جو اس کی آنکھوں کے ٹھنڈے الاؤ روشن کر گیا تھا ——— اور وہ سماج سے بغاوت کر بیٹھی تھی۔

وہ بڑی لگن کے ساتھ اپنے دشینت کے لئے جوگن بنی تھی اور اُسے بن بن لئے گھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خواب تھا۔ روشن مستقبل کا خواب۔ کھلی فضاؤں میں دشینت کے سنگ جھولا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جھولنے کا خواب۔ اس کی ذات میں سما جانے کا خواب —— وہ عشق کو نجات کا وسیلہ سمجھتی تھی۔ وہ کہتی کہ ذات کو پہچاننے کے لئے عشق ضروری ہے۔ عشق ہی کائنات کے ظہور میں آنے کا اصل سبب ہے اس کی سوچ کے مطابق عاشق اور معشوق انسانی وجود کی تکمیل کا نام تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس وجود سے الگ جو کچھ بھی ہے، وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ عاشق کی ذات میں تحلیل ہونے کو جنت سمجھتی تھی، باقی ہر شئے کو دوزخ —— وہ مراقبے اور کشف کی قندیل جلائے اپنے خواب کی تعبیر کی تلاش میں تھی —— اور تلاش انسان کا فطری شوق رہا ہے۔ اسی شوق میں مگن وہ گھر سے ننگے پاؤں نکلی تھی۔ تن کے کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔ پھر بھی وہ خوش تھی، اپنے دشُنیت کے ساتھ ——

گنجان آباد شہر میں اس کی زندگی بے کیفی کا شکار تھی۔ وہی صدیوں سے چلی آری رسمیں، وہی رواج ماحول کی وہی یکسانیت۔ وہی آلودگی۔ نفرت اور کدورت کی چار دیواری میں بند پڑا بوڑھا سماج —— اور اس میں روحوں کو قتل کرنے والے نفس پرست حکمرانوں کا غلبہ۔ شہر کی اس بھیڑ میں اس کے جذبات اور احساسات سسک سسک کر مر رہے تھے۔ بوڑھے سماج کے چوہدری زم زم کے پانی کو گنگا جل میں ملتے ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے خیال میں اس طرح دونوں پانیوں کی پوترتا بھنگ ہو رہی تھی —— اور پوترتا بھنگ ہونے سے دریاؤں میں طغیانی بھی آسکتی تھی —— اور سیلاب سے لوگوں کا جانی اور مالی نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ —— لیکن اس لڑکی کا اعتقاد تھا کہ پانی چاہے زمزم کا ہو یا گنگا کا... وہ صرف پانی ہے۔ بے رنگ، بے مذہب، بے نسل، بے ذات —— ہاں! صرف پاک، صاف اور شفاف —— رواں دواں، بہتا، ہنستا، گاتا ——

شہر کی اس بھیڑ میں اس پر پھینکے جانے والے لفظوں کے تیروں نے اسے چھلنی کر دیا تھا —— وہ خود تو لفظوں کو وضو کرا کر استعمال کرتی تھی لیکن اس پر ہمیشہ بے غسل الفاظ کی یلغار ہوتی رہتی۔ اس کی روح تڑپتی رہتی۔ شہر میں وہ جتنے دن رہی؛... اداس ہی رہی۔ تھکی تھکی سی —— اور آخر اس نے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا —— اپنے دشُینت کو ساتھ لیکر۔ آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہونے کے لئے ——

وہ فطرت کے بخشے ہوئے ان سبز جنگلوں میں آنکلی جو پتھریلی چٹانوں اور ہرے بھرے میدانوں کے زیور سے آراستہ تھے۔ برف پوش کہسار، بادلوں کی مست خرامی، پہاڑی نالوں کا ترنم ——

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور پہلو میں جانم کو ہنستا دیکھ کر اس کی منجمد مسکراہٹیں پگھل گئی تھیں۔ وہ محبوب کی بانہوں میں جھولتی، انگڑائیاں لیتی، دشینت اس کے رخساروں کو سہلاتا۔ دلربا مرگ زاروں، نشیبوں اور ڈھلوانوں میں وہ رینگتی۔ آبشاروں کی بوچھاڑوں سے اپنے جسم کی چنگاریوں کو بجھاتی ــــ اور پھر دشینت کو ساتھ لئے سحابوں کی چادر اوڑھ کر شنگرفی زمین میں گم ہو جاتی ــــ خدا کی اس بے داغ وادی میں وہ بہت خوش تھی۔

وقت تیزی کے ساتھ گذرتا گیا۔ ایک لمبا عرصہ بیت گیا۔ اس کے پیار میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے محبوب کی روح میں تحلیل ہو چکی تھی ــــ لیکن اس کا محبوب ایک ہی قسم کے موسم سے اُکتا گیا تھا، اور اس کے جنگل سے نکلنے کی سبیل ڈھونڈنے لگا تھا۔ سورج کی تپش دن بدن گھٹتی جا رہی تھی۔ مگر وہ محبت کے دریا میں اتنی گہرائی تک ڈوب چکی تھی کہ آنے والے خطرے کو محسوس ہی نہ کر پائی ــــ دشینت حسنِ ازل کی حقیقت کو پہچاننے کی بجائے اپنے وجود کو خدا سمجھنے لگا۔ وہ لمحہ لمحہ اس کی مٹھی سے پھسلنے لگا... اور کہنے لگا

"اپنی زندگی کو میں تمہاری ضرورت پر قربان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں خود قربان نہیں ہونا چاہتا۔"

دشینت کے الفاظ سُنکر وہ تڑپ اٹھی اور اپنے اندر ٹوٹتے بکھرتے جذبوں کو سمیٹتے ہوئے بولی:

"دشینت ! یہ سب احساس کی بات ہے ورنہ ہر چیز وہی ہے جو پہلے تھی۔ صرف تم بدلے ہو۔"

"میں بدلا نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں اور انسان کے طور پر جینا چاہتا ہوں۔ فرشتے کے طور پر نہیں۔"

اور اپنے آپ کو انسان سمجھ کر جینے والا دشنت اس کی مُٹھی سے پھسلتا رہا۔ پھسلن کے اِس مسلسل عمل سے اُس کی آرزوؤں کے گلاب مرجھانے لگے۔ دل کی دنیا ویران ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ سوداگری کے اِس بازار میں اُس نے تو سچے جذبوں کا بیوپار کیا تھا مگر اس کے جواب میں اسے کیا ملا۔ دُکھ، کرب اور اذیتیں ــــ اسے کیا پتہ تھا کہ اتنا لمبا فاصلہ طے کرنے کے باوجود ایک روح دوسری روح میں مدغم نہیں ہو پائے گی۔ اس نے اپنے ماہیوال کو دل کا ماس کھلایا تھا، روح کا شربت پلایا تھا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیکن اس کی ساری عبادت، ساری تپسیا بھنگ ہو کر رہ گئی تھی ——

پھر شنگرنی وادی کی زمین میں سوراخ پڑ گئے........ اور ان سوراخوں سے نیولے باہر نکل آئے نیولے اپنی تیز نوکیلی آنکھوں سے اسے ڈھونڈنے لگے۔ نیولوں کو دیکھ کر سبز جنگل، ہرے بھرے میدان، برف پوش کہسار، پہاڑی نالے.... سب کانپ اٹھے۔ آندھیاں چلنے لگیں۔ پیڑ زخمی ہو ہو کر گرنے لگے، ویرانی پھیلنے لگی۔ نیولوں کی صداؤں سے ہر طرف دہشتوں کے سرکنڈے ابھر آئے...... اور اس کا ناگ دیوتا، دشینت نیولوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ گیا۔ اسے اکیلا چھوڑ کر۔ وہ ریت کا گھر نکلا جو دھڑام سے گر گیا۔ زندگی کے بوجھ کو کندھا دینے کی بجائے اس نے فرار کا راستہ اپنایا اور ساری حکایت کو بالآخر تمام کر دیا۔

دشینت کے بھاگ جانے کے بعد اس کی مستی کی رُتیں سو گئیں۔ اندھیرا پھیل گیا اور وہ بے سلامتی کا شکار ہو گئی۔ سماج کے انگاروں سے دشمنی لینے سے اس کے ہاتھ جل گئے۔ دل بجھ گیا۔ محرومی، گھٹن، خوف اور تباہی، اس کے لئے سماج کی جانب سے بخشی گئی سوغاتیں تھیں۔ اس کی زندگی کی کشتی شکستہ ہو گئی اور درد کی گونگیں فوجیں شکستہ کشتی کو ڈبونے لگیں۔ ستم کا طوفان اُمڈ پڑا۔ اَن سُنی چیخوں کا اژدہا اسے ڈسنے لگا۔ فتنہ پرور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اسے ستانے لگیں۔ کتے غراتے رہے، بھونکتے رہے —— اور وہ تھکی تھکی، ڈری ڈری، اداس، بوجھل..... لمحہ لمحہ ختم ہونے لگی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہونے لگی۔ لفظ گونگے ہونے لگے...... اور پھر گونگے الفاظ بدن کی غار میں گم ہونے لگے —— پھر بہت دیر بعد گم شدہ لفظوں کی صلیب لئے غار سے ایک لاش نمودار ہوئی........ اور شہر کے بیچ کھڑے مینار پر جم گئی، تاکہ......... گم شدہ لفظوں کی عبارت کو آنے جانے والے مسافر پڑھتے رہیں لاش کے ننگے کفن پر لفظوں کے معنیٰ یوں بکھرے تھے۔

"زندگی کا مذہب صرف پیار ہے۔ موت کا کوئی مذہب نہیں۔ لاش کا کوئی دھرم نہیں۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

پتھریلے پانیوں میں بہتی ناؤ

نیلو اور عرفات کی کم سِنی کا عشق جب شادی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔ پندرہ برس کی نیلو اور سترہ برس کے عرفات کی معصوم شوخیاں ندی کے پانی کی طرح چنچل اور آبشاروں کی طرح الّھڑ تھیں وہ کِھلی ہوئی فصلوں کے مانند لہراتے رہے۔ پرندے چہچہاتے رہے اور وقت اپنے بازو پھیلائے اڑانیں بھرتا رہا۔ بھلا گزرتے وقت کو کون نکیل ڈال سکتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ چھ سال کس طرح بیت گئے۔ نجمہ، صغریٰ اور یاسر محبت کی شہنائی سے نکلے تین سُر۔ عشق کی پٹاری سے نکلے تین کبوتر —— دیکھتے ہی دیکھتے نیلو اور عرفات کی کابک میں باجرہ چگنے لگے۔

زندگی کی حقیقتیں پیار کی راہوں میں کانٹے بکھیرنے لگیں۔ ہنسی، قہقہے تفکرات کے گہرے کنویں میں ڈوبنے لگے۔ پریشانیاں بڑھنے لگیں —— نجمہ، صغریٰ اور یاسر —— موتیوں کے سے بچوں کی پرورش، خانگی ضروریات اور ایک معمولی کلرک —— فکروں کا سوداگر عرفات —— زندگی کو سہل بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پھر پڑھائی شروع کردی —— اور چار برس کی سخت محنت کے طفیل اے ایم اے کی ڈگری مل گئی —— اس نے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

نیلو کو بھی تعلیم کی رغبت دلائی۔ بہت کوشش کی لیکن وہ فلمی رسالوں اور رومانی ناولوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ایم، اے کی سند ملتے ہی عرفات نے اچھی ملازمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دئے اور بڑی کوششوں کے بعد اسے ایک کارپوریشن میں منیجر کی آسامی مل گئی۔

تعلیم نے اس کے دماغ کے دروازے کھول دئے اور اسے علم کے دریا میں غوطے لگانے پر اکسایا۔ وہ ادبی اور تاریخی کتابیں پڑھتا رہا۔ اسے کسی بھی اچھے مصنف کی کوئی کتاب ملتی تو پڑھ ڈالتا اور اپنے دوست احباب نیز ادبی ساتھیوں کے ساتھ زوردار بحث کرتا۔ وہ مطالعہ کے زینے سے علم کے منوّر کنویں میں آہستہ آہستہ اُترتا رہا اور پھر نور اس کے بُجھتّے کو چمکانے لگا۔ اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہوتی گئی۔ وہ ایک شاعر اور افسانہ نگار کے روپ میں ابھرنے لگا۔ اشعار اس کے قلب وجگر سے پھوٹنے لگے۔ کہانی اس کے جذبات کی ترجمانی کرنے لگی۔ وہ روز بروز حساس ہوتا گیا۔ اس نے اپنے افکار، خیالات اور جذبات کی کلنج سے باہر نکلنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

نیلو اور عرفات ــــــ تلخی، تُرشی ہونے لگی۔ طبیعتیں تھیں کہ گلے ہی نہ ملتی تھیں ــــ عرفات بالکل آئینے کی مانند نازک، ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جائے اور نیلو..... لاپروا، سخت قسم کا پتھر، بھلا الفاظ کے تیشے سے کہاں ٹوٹے ــــ عرفات، افکار کا سوداگر، زندگی کے باطنی رخ کو دیکھنے کی آرزوؤں میں گم اور نیلو انتہا درجہ کی دنیادار اور رواج پسند، روایت پرست ــــــ عرفات رومانی طبیعت کا مالک اور نیلو دم توڑتے ہوئے بوڑھے سماج کی لونڈی ــــــ خیر ــــ وقت تھا گزرتا گیا۔ نیلو کی چودھراہٹ گھر پر قائم ہو چکی تھی۔ عرفات بے چارہ سمجھوتے کی شیرازہ بندی میں لگا رہتا، لیکن ڈور الجھتی ہی رہتی۔ وہ چاہتا کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ ٹوٹ کر پیار کرے اور ہر آن اس پر جان چھڑکنے کو تیار رہے۔ لیکن نیلو کا سارا پیار فرمائشوں کی ایک بھاری گٹھری بن کر اس کے دل ودماغ پہ سوار ہو جاتا ــــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ کوئی الف لیلوی شہزادہ تو تھا نہیں کہ اس گانٹھ کو اٹھائے دیس بدیس مصائب جھیلتا پھرے۔ وہ چاہتا کہ جب شام کو گھر پہنچے تو نیلو، بچوں کو کھانا کھلا کر اور سُلا کر خود بھوکی بیٹھی ہو ــــ پہلے اسے کھلائے، پھر خود کھائے ــــ لیکن وہ جب بھی گھر پہنچتا نیلو گہری نیند سو چکی ہوتی۔ عرفات خود ٹھنڈا کھانا کھا لیتا اور صبر کے گھونٹ پی لیتا۔ پھر پلنگ پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھنے لگتا یا پھر لکھنے لگتا۔ کبھی کبھار تو اس کا جی چاہتا کہ کہ وہ اپنی تازہ تخلیق نیلو کو سنائے، پھر دونوں اس پر بحث کریں نیلو اپنی رائے دے لیکن وہ ایک ہی جواب سنکر خاموش ہو جاتا" میرا دماغ نہ کھاؤ۔ میں کوئی آپ کی طرح فارغ نہیں۔ گھر کے سو کام ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے افسانے یا نظمیں سنتی رہوں تو گھر کا بس خدا حافظ۔" ــــ لیکن ریڈیو یا ٹی وی پر سنائی گئی کہانی کا چیک طلب کرنا وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ عرفات اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا۔ گھر میں بھگدڑ مچ جاتی، بچے بیچارے گھبرا جاتے۔ عرفات پریشان ہو جاتا اور سوچنے لگتا کہ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ پیڑ اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔

وقت بھاگتا رہا ــــ عرفات ایک مشہور شاعر بن گیا۔ اس کے تین شعری اور دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ اس کا نام مشہور ہو چکا تھا۔ اسے ادبی کارناموں پر متعدد انعامات بھی مل چکے تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تقریبات میں اسے مدعو کیا جاتا۔ افسانے کی محفلیں سجتیں اور مشاعرے ہوتے۔ وہ خوب نام کما رہا تھا۔ اس کی نظم سے متاثر ہو کر متعدد لوگ اس کے قریب ہوتے گئے ــــ اتنے قریب کہ اس کے دل میں اتر گئے۔ اسے بڑا اچھا لگتا، ان کے ساتھ گفتگو کر کے۔ ادب اور ادبی مسائل پر بحث کر کے ــــ ترپت، رانو، چمن، ساگر، اوشا، سوما، اختر، ریتو، برج، للت ــــ عرفات کے دوست احباب، وہ ان کے ہمراہ گھومتا رہتا۔ باغات میں، شاہراہوں اور بازاروں میں۔ ٹی سٹالوں اور کافی ہاؤسوں میں بیٹھ کر اسے ذہنی غذا ملتی۔ وہ کچھ لمحات کے لئے سب کچھ فراموش کر دیتا، گھر کو، گھر کے معاملات کو ــــ لیکن گھر پہنچتے ہی عرفات کو تفتیش کے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"کیوں جی! آپ آج کافی ہاؤس میں کس بو بو سے گلچھرے اڑا رہے تھے۔"؟

" وہ میرے ساتھ سکھبیر اور رانو تھیں۔ دونوں میری ادیب ساتھی ہیں۔ کافی کا کپ پینے بیٹھ گئے تھے، وہاں رانو کی نئی کہانی بھی سنی۔ بعد میں اس پر اچھی بحث ہوئی لیکن تمھیں کیسے پتہ چلا؟"

" ان آوارہ عورتوں کے ساتھ کافی پینے اور گفتگو کرنے میں آپ کو بہت مزہ آتا ہے۔ کبھی مجھے بھی باہر لے گئے ہوں گے! وہ آپ کی ساتھی ہیں اور میں ٹھہری آپ کی زر خرید لونڈی۔ آپ کی نوکرانی۔ آپ کے بچوں کو پالوں، ہر طرح کی مشقتیں برداشت کروں اور آپ ان رنڈیوں کے ساتھ آوارہ گردی کریں۔"

" لیکن تمھیں کس نے بتایا؟"

" مجھے بلّو بھائی نے بتایا تھا کہ بھائی جان اکثر جوان لڑکیوں کے ساتھ گھومتے دکھائی دیتے ہیں، اور آج بھی دو لڑکیوں کے ہمراہ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے —— دیکھئے جی! آپ کان کھول کر سن لیں، میں چھوٹے دل کی مالک تو ہوں نہیں کہ رونا دھونا شروع کردوں گی یا روٹھ کر اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ آپ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"یہ تو بالکل سچ ہے۔"

" مذاق کو رہنے دیں۔ آپ کو تو کسی کی شرم ہی نہیں۔ بھلا لڑکیوں کے ساتھ کیسی دوستی۔ آپ کو تو نہ عزت آبرو کا خیال ہے، نہ چھوٹے بڑے کی پروا اور نہ سماج کا خوف۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ کان کھول کر سُن لیجئے۔ آج کے بعد آپ گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر آیا کریں گے۔ آج سے آپ کی ساری ادبی اور غیر ادبی سرگرمیاں ختم۔"

فاصلہ بڑھتا گیا۔ اب عرفات کو نیلو کے ساتھ رہنے کی کافی بڑی قیمت چکانی پڑتی۔

" سنا ہے آپ کی تنخواہ بڑھ رہی ہے۔ ساتھ ہی ڈی۔ اے کی سات قسطیں بھی اکٹھی مل رہی ہیں؟"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"جی ہاں ! آپ نے بالکل سچ سنا ہے۔"

"تو پھر پیسے مجھے دینا۔ عید آرہی ہے بچوں کے لئے نئے کپڑے سلوانے ہیں۔ ان کے پاس کہیں آنے جانے کے لئے ڈھنگ کا کوئی کپڑا ہی نہیں ہے۔ یاسر اور صغریٰ کے سویٹروں کے لئے اون بھی خریدنی ہے۔ نگّی کے لڑکے کی سالگرہ ہے وہاں بھی کچھ دینا لینا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کتنا کچھ کرتی ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی یاسر کے لئے اس نے جاپانی ٹیرالین کی ایک پینٹ لاکر دی تھی۔ راجاں کے لڑکے کا عقیقہ بھی آئندہ ماہ کی دس کو ہے اور راجاں میری بہت پیاری سہیلی ہے، اسے بھی ذرا اچھا سوٹ دینا ہے اور بھی چھوٹے موٹے کئی خرچ ہیں۔ خبردار! اگر فضول کتابوں یا رسالوں کی گٹھری خرید کر گھر لائے سکیڑوں کی خوراک بنانے کے لئے۔ سن لیا نا آپ نے ؟"

"میں نے تو سن لیا ہے، لیکن جتنی تمھاری فرمائشیں ہیں اتنے تو پیسے بھی نہیں ملیں گے۔"

"میں نے کون سا آپ کو پولسٹر کا سوٹ سلوانے کے لئے کہا ہے۔ آج کل بازار میں اتنے خوبصورت کپڑے بک رہے ہیں۔ شاموساٹن، ٹیری کریب، سپّن اور دوسرے عمدہ کپڑے۔ کبھی میرے لئے بھی کوئی اچھا سوٹ لائے ہوں گے آپ ؟ فرمائشیں پوری کرنے کے لئے پیسے نہیں —— یہ تو دنیا داری نبھانی ہی پڑتی ہے۔ اس میں فرمائشیں کیسے ہوئیں۔ آپ کا کیا ہے۔ صبح سویرے گھر سے نکل جانا اور رات گئے گھر واپس آجانا۔ گھر کو تو ہوٹل سمجھ رکھا ہے آپ نے۔ کسی آئے گئے کی خبر ہی نہیں۔ ملنے جلنے کا خیال ہی نہیں۔ صرف کتابیں پڑھنا، اوٹ پٹانگ لکھنا یا پھر آوارہ گردی کرنا۔ کبھی کوئی شعری نشست اور کبھی کوئی ادبی تقریب۔ آگ لگے آپ کی محفلوں کو۔"

"بکواس بند کرو۔ آگ تیری دنیا داری کو نہ لگے۔ جھوٹی رسمیں، جھوٹے رواج اور جھوٹی شان —— تمھارے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ تمھاری کونسی جائز ضرورت میں پوری نہیں کرتا۔ لیکن فضول باتیں نبھانے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں کوئی حرام کی کمائی نہیں کرتا۔ صرف تنخواہ کا سہارا ہے۔"

"اور جنھیں روزانہ ہوٹلوں اور کافی ہاؤسوں پر لئے پھرتے ہیں، ان کے لئے آپ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

آپ کے پاس رقم کہاں سے آجاتی ہے۔؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں پوری تنخواہ تمھارے ہاتھ میں تھما دیتا ہوں۔ باقی رہ گئی بات ہوٹلوں کی اور کافی ہاؤسوں پر جانے کی، تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ حساب سبھی کا برابر رہتا ہے ——— کبھی کوئی دل خوش کرنے کی بات بھی کی ہے تم نے۔ جب دیکھو لڑائی کے لئے تیار۔"

عرفات ایک تنہا آدمی ——— نیلو اس پر سماج کی اجارہ داری قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سوسائٹی کی ضروریات پر قربان کر دینا چاہتی تھی۔ وہ عرفات کو سماج کا مبلغ بنانا چاہتی تھی۔ نیلو اسے ایک گھٹن اور حبس کے ماحول میں قید کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تو کھلی فضاؤں کا باسی تھا۔ اس کے لئے سماج کا لفظ بے معنیٰ تھا، فضول تھا ——— عرفات اپنے ذہن میں خیالات کی ٹھیکریاں اکٹھی کرتا رہتا۔ وہ ان کو گول گول گھڑتا اور پھر اپنے دل کی گیند سے سنتولیا کھیلتا۔ گیند اتنے زور سے پڑتی کہ ٹھیکریاں چکنا چور ہو جاتیں۔ اور عرفات کی آنکھوں کے سامنے نجمہ، صغریٰ اور یاسر آجاتے۔ تین کبوتر ——— کابک میں دانہ چگتے ——— وہ خاصی دیر تک اپنی دنیا کو ناچتے، کودتے اور ہنستے، کھیلتے دیکھتا رہتا۔ اسے ایک سرور سا ملتا۔ وہ ایک میٹھی ہنسی ہنستا اور پھر کوئی کتاب پڑھنے میں لگ جاتا ———

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

آوارہ سانپ کا ڈنک

اپنے خون میں نہایا ہوا انسان ، سرخ آنکھوں ، سرخ ہونٹوں اور سرخ ہاتھ پانو والا انسان ـــــ مجھے اپنی جلائی ہوئی آگ دے گیا ہے اور یہ حکم سنا گیا ہے کہ میں اس آگ کو اپنے سر پر اٹھائے شہروں ، گانووں ، جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں رہوں ۔ سر پر اٹھائی ہوئی یہ آگ ، لاوے کی شکل میں میرے بدن میں بھی گھُلی ہوئی ہے ۔ میری ہڈیوں میں رچی ہوئی ہے ۔ اس آگ کے الاؤ میں صرف میرا وجود جل رہا ہے ۔ کیوں نہ جلے ـــــ ایک سرسبز باغ کی مالک ہوتے ہوئے بھی مجھے اس آگ میں کودنے کا شوق چُرایا تھا ۔ میری گھریلو زندگی کا مالک ـــــ دلاور ، میرا پورا خیال رکھتا تھا ۔ وہ میرے پھولوں کو پانی دیتا ، بوٹے ، پودے سجاتا ، انھیں ہنساتا ۔ میں مسرور تھی ۔ پھول خوش تھے اور مالی بھی خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا ۔ زندگی ہنستے کھیلتے گزر رہی تھی ۔ میرا بہت اونچا بالاخانہ تھا بُرجوں والا ۔ اور انہی بُرجوں میں سے ایک برج ـــــ نہ معلوم کس گھڑی میرے سینے میں پیوست ہو گیا تھا ۔ اس اونچے برج کا نام انارگُل تھا ۔ سرخ چہرہ ، سرخ آنکھوں ، سرخ ہونٹوں ، سرخ ہاتھوں اور سرخ پاؤں والا انارگُل ـــــ جو اپنی روشن کی ہوئی آگ مجھے دے گیا ہے ۔ چوڑا سینہ ، گھنی زلفیں ، گٹھا ہوا بدن ، بالکل الف لیلے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کی کہانیوں کا شہزادہ لگتا تھا۔ کافر عربوں کے بڑے بت ہُبل کی مانند ـــــ اس کی سوہنی مورت مجھے کافر بنا گئی۔ میں اپنے خدا کو بھول گئی۔ دلاور کو بھلا دیا، اپنے پھولوں کو فراموش کر دیا ـــــ ہنستی کھیلتی زندگی، اونچا بالاخانہ، برجوں والا، سب کچھ اس بت کی ایک نظر کے ساتھ ہی بھسم ہو گیا اور باقی رہ گیا ـــــ ایک ہی برج، قسمت والا، نصیبے والا ـــــ انار گلُ ـــــ میں کفر کے جال میں پھنس گئی اور انار گلُ کو جنم جنم کا ساتھی سمجھنے لگی۔ میں نے اپنی بے مقصد زندگی کا صرف ایک ہی مقصد بنا لیا کہ انار گلُ کو دیکھتی رہوں۔ مرغِ بسمل کی طرح اس کے آگے پیچھے پھڑپھڑاتی رہوں ـــــ اور اس کے وجود میں ڈھل کر ختم ہو جاؤں۔ میں معاشرتی قانون کی کتابِ کہنہ چاک کر دینا چاہتی تھی اور خدائی قانون کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس قانون کے مطابق ـــــ جس کے طفیل زمین سورج کے گرد گھومتی ہے ـــــ اور میری زمین کا سورج تھا انار گلُ ـــــ میرے کفر کا خالق، میرا ہبل دیوتا۔ مجھے اونچے بالا خانے والا گھر ایک قبر کی مانند محسوس ہونے لگا۔ جس میں میں نے اپنی زندگی کو دفن کر رکھا تھا۔ میں محسوس کرنے لگی کہ دلاور نے میرے جسم سے، میرے بالاخانے سے، میری دولت سے شادی کی ہے میری روح سے نہیں۔ میں سوچتی اگر دلاور کی شادی میری روح کے ساتھ ہوئی ہوتی تو انار گل کا کہیں وجود بھی نہ ہوتا۔ اس خیال نے میری روح کو باغی بنا دیا۔ میں اپنے نفس کی بات ماننے لگی۔ میں نے اپنے دل کی درگاہ کے سارے چراغ گل کر دئے۔ دلاور، بچے، والدین بھائی بہن سب اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ اب درگاہ میں صرف ایک ہی دیا روشن تھا کفُر کا دیا ـــــ شعلوں والا ـــــ ہبل دیوتا۔

مجھے دیوتا کے قدموں میں بیٹھ کر سرُور ملتا۔ اس کے پتھریلے جسم کے ساتھ اپنا بدن رگڑنے میں لطف آتا۔ بے حد سکون محسوس ہوتا۔ خدا نے جسم کو روح کا مندر بنایا ہے لیکن میرے مندر کا کلش بن گیا ـــــ میرا دیوتا، انار گلُ ـــــ اور پھر تمام چمکتی ہوئی چیزیں میرے واسطے بے مصرف ہو گئیں۔ میں اپنے خوابوں کے شہزادے کو پاکر بے حد مسرور تھی، میں نے اسے بحرِ الفت سمجھ لیا اور اس میں ڈوب گئی۔ میری بھوکی اور پیاسی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

زمین سیر ہو کر کھانا کھانے لگی، اور سیراب ہو کر پانی پینے لگی۔ انار گُل کے جسم میں سے مجھے انار کے سرخ پھولوں کی خوشبو ملتی۔ میری خواہشوں کی چنچل ندی دریا میں گرنے کے لئے مچلتی رہتی ـــــ اور ندی جب دریا سے مل جاتی ہے تو پُر سکون سمندر کا روپ دھار لیتی ہے۔ رات کا چاند اور دن کی روشنی ـــــ میرا انار گُل، میرے آنگن میں مہکنے لگا ـــــ مجھے گذری راتوں اور گئے دنوں کی زندگی بے کار محض لگنے لگی لیکن ہبل دیوتا کی معیت میں میری روح کی بنجر زمین زرخیز ہو گئی۔ اور میں اپنے ماضی کو بھول گئی اور دُور تک پھیلے ہوئے اپنے لمبے سائے کو ہی اپنی ذات سمجھ بیٹھی۔ انار گُل کے سبب سماج کے بوڑھے درخت کی وہ مضبوط شاخ ٹوٹ گئی جس پر میں اور دلاور بیٹھے تھے ہم دونوں گر پڑے۔ دلاور ریتیلے کنویں میں گرا اور میں انار گُل کی گود میں۔ دلاور میرے ہاتھوں سے پھولوں کا گُلدستہ چھین کر لے گیا۔ مجھے پھولوں کی محرومی کا کوئی غم نہ ہوا۔ میرے دیوتا نے مجھے ہر شے سے بے پروا بنا دیا تھا۔ میں نے ہبل دیوتا کے لئے سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

لیکن بُت آخر بُت ہی ہوتا ہے ـــــ پتھر کا، اور پتھر کبھی موم نہیں بن سکتا میں سدا کے لئے دیوتا کے ساتھ بندھ جانا چاہتی تھی لیکن انار گُل ...... سمندر میں ابھری ہوئی ایک ایسی چٹان تھا جس سے طوفانی موجیں جس قدر چاہیں ٹکرائیں اسے ریزہ ریزہ نہیں کر سکتیں۔ انار گل نے میری محبت اور عقیدت کی قدر نہ کی۔ اس نے جلد ہی میری روح کے آبگینے کو پاش پاش کر دیا۔ میں بہت تڑپی، بڑی آہ وزاری کی، پتھر کے بُت سے سر ٹکرایا اور زخمی ہو گئی۔ میرے دل کی دنیا اجڑ گئی۔ میری رُوح یتیم ہو گئی ـــــ اور میں بے سُدھ ہو کر اونچے بُرجوں والے بالاخانے میں گر پڑی۔ یکہ و تنہا۔ پشیمان و پریشان۔ میرے بالاخانے کے تمام بُرج میرے سینے میں پیوست ہو گئے۔ میں درد سے بے سُدھ رہنے لگی۔ مجھے میرے کُفر کا بدلہ مل گیا۔ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں بچا ـــــ دلاور، پھولوں کا گلدستہ، ہنستی کھیلتی زندگی، سُرخ آنکھوں سُرخ ہونٹوں، سُرخ ہاتھوں اور سُرخ پاؤں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

والا انارگلؔ ــــــ کچھ بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔ لیکن معاشرتی قانون کی کتابِ کہنہ نے آج مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یہ پرانی کتاب میں نے پھاڑنا چاہی تھی لیکن میرے نازک ہاتھ کتاب کو چاک نہ کر سکے۔ اسی کتاب کے اوراق میں آج میں گھری ہوئی ہوں ــــــ کیوں کہ میری پیشانی پر انارگلؔ کی بخشی ہوئی آگ جل رہی ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دُشمن کون

"ہنس کے لیا تھا پاکستان، لڑکے لیں گے ہندوستان"
"چاہے مارو اپنی جان، مٹ کے رہیگا پاکستان"
"اگر بھارت نے ہمارے کسی علاقے پر قبضہ کرنے کی جرأت کی تو ہم بھرپور لڑائی چھیڑ دیں گے۔
پاک فوج کے شیر جوان ـــــ دشمن کو مٹانے کے لئے پوری طرح تیار ہیں"
"اگر پاکستان نے بھارت کے ساتھ جنگ چھیڑنے کی حماقت کی تو یہ اس کے گھر میں لڑی جائے گی اور اسے تباہ و برباد کر دیا جائیگا۔"
لیڈروں کے یہ بیان ــــ آج کل پاک اور بھارت کے ریڈیو اور اخباروں کی بڑی سرخیاں بن گئے ہیں، لیڈروں کے ان بھاشنوں سے دونوں جانب جنگی جنون پھیل چکا ہے۔ جہاں جائیے ــــ جدھر جائیے ــــ جنگ کی ہی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ ہماری فوجیں دشمن فوجوں کے مقابل کھڑی ہیں۔ سرحدی دیہات خالی کرائے جا رہے ہیں۔ بلیک آؤٹ کی مشقیں کی جا رہی ہیں۔ ملک کا بچہ بچہ دشمن کو مٹا دینے کی قسمیں کھا رہا ہے۔
آج دیوالی ہے۔ ہم والینٹر کور کے کچھ ساتھی مٹھائی بانٹنے بارڈر پر گئے ہوئے ہیں۔ گڑکھال چکر دتی اور مرتھن کی سرحدی چوکیوں سے ہوتے ہم سچیت گڑھ پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری پکٹ ابھی چوکی سے کچھ ہی فٹ کی دوری پر ہے اور سرحدی حفاظتی پولیس کے جوانوں کے بالکل سامنے ستلج رینجرز کے سپاہی کھڑے ہیں۔
"او کافرا ــــ اوئے کافرا" یار سے کسی نے آواز دی ــــ آج دیوالی ہے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

مٹھائی نہیں کھلاؤ گے ؟"۔

" اوئے مُسلے ـــــ تم لوگوں نے ہمیں مٹھائی کھلانے کے قابل رکھا ہی کہاں ہے تمھارے فوجی حاکم تو آئے دن لڑائی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

" رہنے دو یار، رہنے دو ـــــ کم کوئی بھی نہیں ہے ـــــ باقی ہم تو ٹھہرے حکم کے غلام خیر چھوڑو ان باتوں کو ـــــ تم ہمیں مٹھائی کھلاتے ہو یا نہیں ؟ ـــــ اور وہ ہنس پڑا۔

" ہاں بھائی! کیوں نہیں کھلائیں گے ـــــ ابھی منگواتے ہیں۔"

" ہاں دیکھو یار ! کیلے ضرور منگوالینا " ـــــ وہ اپنی چوکی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

" صوبیدار صاحب ! کون تھا یہ ؟" میں نے پوچھا۔

" دوست یہ پاکستانی چوکی کا انچارج ہے ـــــ بٹوارے سے پہلے ہم ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ بہت پیارا شخص ہے ـــــ یار ہے اپنا ـــــ ہر عید کو ہمیں مٹھائی اور کینو کھلاتا ہے۔ آج کل ذرا سختی ہوگئی ہے۔ ورنہ ہم تو اکٹھے والی بال بھی کھیلتے ہیں۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چوکی انچارج نے سپاہیوں سے دو دو روپے چندہ اکٹھا کیا اور ایک سپاہی کو کیلے اور مٹھائی خریدنے شہر بھیجدیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد وہ سپاہی شہر سے پلٹ آیا۔

" اوئے مختارے ـــــ آؤ بھئی آؤ ـــــ کھالو مٹھائی "

" کیا لے آئے ہو مٹھائی؟"

" ہاں ہاں ! لیکن میں خود ہی بانٹوں گا۔"

" نہیں رچھپالے ـــــ ایسا ممکن نہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ آج کل سخت آرڈر ہیں ـــــ پر تُم کیلے اور مٹھائی لیکر گیٹ تک آسکتے ہو۔"

رچھپال مٹھائی اور کیلوں سے لدی ٹوکری لیکر گیٹ تک گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے گلے ملے میں نے دیکھا کہ وہ نہیں مل رہے تھے بلکہ انکی تہذیب گلے مل رہی تھی۔ انکے دل گلے مل رہے تھے۔ وہ دل جو ایک ہی مٹی سے بنے ہیں، دونوں کی آنکھوں سے راوی اور چناب بہنے لگے۔ مختارے نے بھی کینوؤں کا ٹوکرا رچھپال کو پکڑا دیا اور پھر دونوں اپنے اپنے ملک کی سرحد کے اندر آگئے۔ اُس سرحد کے اندر جہاں سے دُور ـــــ بہت دُور ـــــ شہروں میں بیٹھ کر ملک کے لیڈر، دشمن کو تباہ و برباد کرنے کے نعرے لگا رہے ہیں ـــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دِل کی گلیاں

حسینی والا کسٹم چوکی پر ضروری کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال کے بعد جمّن بابا کو سرحد پار جانے کی اجازت مل گئی۔ کسٹم گیٹ پار کر کے میں اسے بس میں بیٹھا پاکستان کی دھرتی کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ پنجاب روڈ ویز کی بس اسے گنڈا سنگھ والا کی کسٹم چوکی کی طرف لے جا رہی تھی۔ ۸۵ سالہ بوڑھے کے چہرے کی جھریاں مسکرا رہی تھیں۔ پژمردہ آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی اور بجھے دل میں عید کی سی رونق۔ وہ بڑا خوش تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، آج تیس سال بعد اس کی مرادیں جو بر آئی تھیں۔ آج یعقوب کو اس کا یوسف ملنے والا تھا۔ آج بابا اپنے بیٹوں بیٹیوں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں اور شاید ان کے بھی بچوں کو ملنے جا رہا تھا۔

۱۹۴۷ء کی شورش میں جمّن بابا کا پورا خاندان پاکستان چلا گیا تھا۔ انھوں نے تو بابا کو بھی ساتھ لیجانے کی بہت کوشش کی، منت سماجت کی۔ لیکن بابا نہیں مانا۔ وہ اپنی دھرتی، اپنا گھر اور اپنے لوگ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

وہ اپنے گھر میں اکیلا رہ گیا۔ اُس گھر میں ـــــ جہاں سب سے پہلے مولوی صاحب نے اس کے کانوں میں اذان کہی تھی۔ وہ گھر جس کے آنگن میں اس نے بچپن گزارا تھا، وہ گلیاں جہاں کھیلتا ہوا وہ جوان ہوا تھا۔ وہ گھر ..... جہاں وہ دُولھا بن کر ...... گھوڑی پر بیٹھ کر گیا تھا اور ڈولی میں دلہن کو بٹھا لایا تھا۔ وہ گھر، جس کے آنگن میں اس نے اپنے بچوں کو ہنستے کھیلتے، گاتے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ اس گھر کو چھوڑ کر کیسے جاتا...... جہاں اس کے بچپن جوانی اور بڑھاپے کی یادیں بکھری پڑی تھیں ـــــ بچوں کے چلے جانے پر شروع شروع میں وہ بہت اداس رہا ـــــ لیکن پھر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دھیرے دھیرے اس کا دل لگتا گیا۔ اس چار دیواری میں بسی پرانی یادوں اور گھر میں رہنے والے نئے لوگوں کے ساتھ جو جمن بابا کے کرایہ دار بن گئے تھے۔

بابا مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ اپنے سگے سمبندھیوں کے بچھڑ جانے کے بعد اسے پہلی خوشی مجھی سے ملی تھی۔ بابا نے خود اپنے ہاتھوں میرے بال کاٹے تھی۔ ختنہ کرایا تھا ـــــ وہ سارا سارا دن مجھے گود میں اٹھائے لیے پھرتا ـــــ نماز پڑھتے ہوئے اور تلاوت کرتے ہوئے...... میں جمن بابا کی گود میں جا بیٹھتا۔ اس کے کپڑے ناپاک کر دیتا، مگر اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آئی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کھلا ہوا رہتا۔ بابا کی گود میں کھیلتے ہوئے ہی تو میرے دودھ کے دانت ٹوٹے تھے۔ اسی کی محبت اور شفقت کے مہکتے سائے تلے، میں نے دنیاداری کے کوچے میں قدم رکھا تھا ـــــ اور آج اسی جمن بابا کو چھوڑنے میں حسینی والا سرحد تک آیا تھا۔

خط و کتابت سے معلوم ہوا تھا کہ جمن بابا کا خاندان پاکستان میں کافی خوش حال ہے۔ ایک بیٹا راولپنڈی میں ٹھیکے داری کرتا ہے۔ کچھ دن پہلے ہی اس کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا کہ آریہ محلے میں اس نے نیا مکان بنا لیا ہے اور بہت مزے میں ہے۔۔ بابا کا دوسرا بیٹا، پاکستانی فوج میں کرنل ہے ـــــ سیالکوٹ میں رہائش ہے ـــــ بابا کی ایک بیٹی ڈاکٹر ہے تو دوسری لنڈن میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر وہاں کپڑے کا کاروبار کرتا ہے ـــــ بابا کبھی کبھی بڑے پیار سے، بڑے چاؤ سے ان کی باتیں مجھے سنایا کرتا۔ مگر پچھلے چند ماہ سے بابا چپ چپ رہنے لگا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا تھا ـــــ ایک دن مجھ سے کہنے لگا:

"بیٹا خدا جانے کون سی گھڑی کا مہمان ہوں۔ موت تو آنی ہی ہے، مگر مرنے سے پہلے بال بچوں کو ملنے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔ ان سیاسی بھیڑیوں نے تو ملک کا بیڑا ہی غرق کر دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جہاں جی چاہے چلے جاتے تھے۔ نہ کوئی غدار تھا نہ قوم پرست۔ بس سیدھے سادے ہندوستانی تھے، مگر آزادی کیا ملی ہر طرف تباہی مچ گئی۔ ملک تقسیم ہو گیا مگر دل تو تقسیم نہیں ہوئے۔ ایک دھرتی اور کئی نام ـــــ آخر کیوں؟ یا خدا، آج پھر کوئی ولی یا مہاتما بھیج جو ہمیں ایک کر دے۔ کاش میں ایک بار اپنے بال بچوں سے مل لیتا ـــــ لیکن شاید ـــــ یہ میری قسمت میں نہیں ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور پھر میں بابا کی تمنا پوری کرنے کی کوشش میں جُٹ گیا۔ پورے سال بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں پاسپورٹ بنا اور پھر پاکستان جانے کے لئے تین مہینے کا ویزا بھی مل گیا۔

بابا کو چھوڑنے کے بعد دوسرے دن میں گھر لوٹ آیا اور اپنے کاموں میں لگ گیا۔ بیساکھی آئی دیوالی آئی، عید آئی مگر بابا نہیں آیا۔ نہ ہی اس کی کوئی چھٹی۔ ہم سمجھے کہ یا تو بابا اللہ کو پیارا ہو گیا ہے یا پھر بیٹوں نے آنے ہی نہیں دیا۔ اور اس نے بھی شاید یہی سوچا ہو کہ کیوں نہ زندگی کے باقی ماندہ دن تو سُکھ چین کے ساتھ اپنے بیٹے بیٹیوں میں رہ کر گزار لے۔ اور نہ سہی مرتے وقت پانی کا گھونٹ تو پلائینگے۔

دن گزرتے گئے۔ سارے کرایہ دار خوش تھے کہ بوڑھا تو گیا ——— اب مکان کے مالک وہ خود ہیں۔ کرائے کے بارے میں بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ بابا کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے وہ اس کے رشتہ دار بن گئے تھے۔ اب وہ کسی کا چچا تھا تو کسی کا تایا ——— کسی کا ماموں تھا تو کسی کا پھوپھا۔

اور پھر ایک دن ——— بابا کا ایک نیا رشتے دار پیدا ہو گیا۔ ایک عورت صبح تڑکے تڑکے مکان میں گھس آئی اور کہنے لگی "سگی بہن کی بیٹی ہوں بابا کی ——— یہاں اس کی اصل وارث میں ہی تو ہوں ——— خالی کرو میرا مکان ——— مجھے اس کی مرمت کرانی ہے۔"

"مگر بی بی تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم اس کی بھانجی ہو۔ ہمارا بھی تو چچا لگتا ہے وہ۔ اور بھائی کی اولاد کا حق تو ہوتا بھی زیادہ ہے۔"

"ارے ——— ماموں کا تو کوئی بھائی تھا ہی نہیں ——— جھوٹ بکتے ہو تم۔ اب وہ تو واپس آئیں گے نہیں ——— مجھے خود پاکستان سے خط لکھا ہے کہ شہریت مل گئی ہے انھیں پاکستان کی۔ اب تم لوگ اپنا سامان سمیٹو اور دو دن کے اندر اندر مکان خالی کر دو میرا۔"

آئے دن اِن نام نہاد رشتے داروں میں بحث و تکرار ہوتی رہتی۔ دعوے اور جوابی دعوے ہوتے رہتے ——— اور پھر ایک دن مجھے ایک سایہ سا اپنے گھر کی طرف آتا دکھائی دیا ——— کسی بھوت کا؟ ——— نہیں نہیں انسان کا ——— لمبی سفید داڑھی، سر پر پگڑی، بغل میں گٹھری دبائے ہاتھ میں چھڑی اور پیچھے پیچھے ایک مزدور۔ وہ انسانی ہیولا آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے نورانی چہرے میں بدل گیا اور وہ چہرہ، وہ سدا بہار پیارا چہرہ، میرے جمن بابا کا تھا۔"

"السلام علیکم" ——— "وعلیکم السلام" ———

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"بابا آگیا ـ بابا آگیا" بچوں نے گھر سر پر اٹھا لیا ـــــ سارے بابا کی خیر خیریت پوچھنے لگے ـــــ "بابا اتنی دیر کیوں لگا دی آپ نے ۔"

"بیٹا وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے ۔ سب کو ناراض کر کے آیا ہوں میں تو، تم تو سب ٹھیک رہے نا، گلی محلے والوں کا کیا حال ہے ؟"

"ہاں بابا سب ٹھیک ہیں ۔ تم وہاں اچھی طرح تو رہے، بچے کیسے ہیں"؟ ـــــ

"اللہ کا شکر ہے ۔ سب خوش ہیں ۔ بڑی خدمت کرتے تھے میری ۔ سارا سارا دن کار میں گھمائے پھرتے ۔ تم لوگ سناؤ ۔ مستری کرم دین کا کیا حال ہے ۔ ماسٹر رام لعل کی بیٹی کی شادی ہوگئی یا نہیں ۔ پنڈت ایشر داس کیا میرے بعد بھی یہاں آتے رہتے تھے ۔؟"

"ہاں کبھی کبھی تمھارے بارے میں پوچھنے آجاتے تھے ۔ مگر بابا یہ تو بتاؤ جب وہ لوگ تمھاری اتنی سیوا کرتے تھے تو پھر وہیں کیوں نہیں رہ گئے ۔ یہاں کیا لینے آئے ہو ؟"

ٹھیک ہے بیٹا ! وہاں میرے سارے اپنے تھے ۔ وہ میری بڑی خدمت کرتے تھے، بہت چاہتے تھے مجھے ۔ پر تم سمجھ نہیں سکتے بیٹا ! وہاں مجھے اپنا ماحول نہیں ملا ۔ اُس مٹی میں مجھے اپنے پرکھوں کی روحیں دکھائی نہیں دیں ۔ اُن گھروں میں ماں کی لوریاں نہیں سنائی دیں ۔ اُس مٹی میں مجھے اپنے پن کی خوشبو نہیں ملی ـــ وہاں نہ یار دوستوں کے قہقہے تھے نہ جھگڑے ـــــ وہاں میرا دل نہیں لگا بیٹا ـــــ بالکل نہیں لگا مجھے گھر کی یاد ستانے لگی ۔ میں بے چین ہوگیا ۔ اور وہاں سے چلا آیا ـــــ اپنے بچوں کو خفا کر کے میں آگیا ـــــ اُس دھرتی کی جانب ـــــ اُس مٹی میں ـــــ اُن گلیوں محلّوں میں جو میرے اپنے ہیں ـــــ جنھیں میں بھول نہیں سکتا ـــــ" اور بابا کی آنکھوں سے جذبات میں ڈوبے موتی چھلک پڑے ـــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گوری فصل کے سوداگر

برگد کا سیاہ بوڑھا پیڑ رات کی تاریکیوں میں اپنے ذہن وعقل کے دریچوں کو مقفّل کر کے ایک پُراسرار کھیل میں اُلجھ کے رہ جاتا ہے اور ہر صبح وادیٔ گُل پوش کے کسی گُل کی طرح حسین، گرم سورج کی ٹھنڈی کرنوں سے دُھلا اِس کا چہرہ ــــ ہر شخص اس کے لمس کو پانے کی خواہش میں رہتا ہے۔

ہاں! یہ وہی برگد کا پیڑ ہے جو کبھی تخ بستہ ہواؤں میں، سمندر کی خوفناک لہروں میں، کالے بادلوں کی چادر میں، اپنی درخشاں چہرگی کو سنبھالے ہوئے اپنے گِرد بنی لوہے کی فصیل سے جا ٹکرایا تھا۔ پیرامڈ کی دیو مالاؤں کو، ظلمت کے پہاڑوں کو ــــ ریزہ ریزہ کرنے کی جدوجہد میں زمین کی سختیاں سہتا تھا اور اپنے آہنی ارادوں سے دھرتی پر اُگی ہر فصل کو بھایا تھا، کیونکہ اس فصل کے ٹوٹے چہرے بے سبب جرم سے پناہ مانگتے تھے۔ اور برگد کا پیڑ ــــ کہ جس کی دانشوری، سیاست وفراست کی دھوم تھی، اپنے وجود میں ثابت وسالم، نفس نفس فِکر کے زاویے بناتا رہتا۔ اس کے ذہن کی روشن گپھاؤں میں جانے کتنے خیالات روپوش رہتے۔ اور جب جب روشن گپھاؤں سے اجلی

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کرنیں ٹوٹے چہروں پر پڑتیں ـــــ اُنھیں ان کا شہرِ آرزو آباد ہوتے دکھائی دیتا ـــــ اور پھر ایک دن ـــــ برگد کے پیڑ نے ٹوٹے چہروں کو صدیوں کی پیاس بجھانے کے لئے سمندر لاکر دیدیا۔ اُس روز نیم کے منڈوے تلے بیٹھا وہ بے غم پگلا منصور چلّا اٹھا تھا ـــــ "یہ سمندر مگر سراب کا ہے ـــــ سراب کا ہے ـــــ سراب کا ہے، رجنی گندھا کے پھول باسی ہیں ـــــ باسی ہیں ـــــ پھول باسی ہیں، چھپکلی مکھی کا شکار کر رہی ہے ـــــ چھپکلی ـــــ مکھی ـــــ"

اُس کی آواز بستی کی گرم ہوا کھا گئی اور یوں برگد کا پیڑ اُن کے خوابوں کا خریدار بنا ـــــ بوڑھے برگد کے قدموں کے نیچے مہتاب و کہکشاں کی بلندیاں آگئیں۔ لامکان اس کے قبضۂ اختیار میں ہوا۔ خاک و باد پر اس کی حکمرانی قائم ہوئی اور اِس امر نے اُس کو اِس عمر میں بھی توانا بنادیا۔ اُس کے اندر چھپا جوبن اُس کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے لگا ـــــ اور بوڑھے برگد کے پیڑ کے سائے میں پلنے والا صنوبر کا وہ کم سن شجر کہ جس کی بھینی بھینی مہک بوڑھے برگد کے لاشعور میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے ذہن و دل پر ایک وجد طاری کر دیتی ہے اور ہاں! یہی وہ ساتھی ہے کہ جس کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں پراسرار کھیل کھیلا جاتا ہے ـــــ کھیل جو کھلاڑی کے لئے تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ اُس کا کشکولِ آرزو بھر جاتا ہے۔ اُس کے فلسفے، افکار و نظریات کو چند لمحوں کے لئے ساکت کر دیتا ہے۔ وہ کمسن شجر، جو کچی شاخوں پہ اٹھتی ہوئی مہکتی ہوئی ـــــ بلوغیت کی لذّت محسوس کرنے لگا ہے، اب اپنے لئے بھی راحت کا سامان چاہتا ہے۔ اور پھر ایک روز وہ مخاطب ہوا:

"دھوپ کا ایک ٹکڑا ـــــ میرے آنگن میں روز آتا ہے۔ یہ دھوپ کا ٹکڑا، مندر کے پچھواڑے سے اُبھرتا ہے۔ اندھی گلیوں کو چیرتا ہوا، کھُلی فضاؤں میں مجھے پکارتا ہے اور کہتا کہ اس کی روشنی میرے لئے ہے۔ اس کا سب کچھ میرا ہے ـــــ وہ مجھ سے بیلا چمبیلی کی طرح لپٹ جاتا ہے ـــــ میرے ذہن و دل کو سہلاتا ہے۔"

کم سن شجر مہک رہا ہے، چہک رہا ہے۔ وہ روز ـــــ دن کی اندھی روشنی میں خلوتوں میں جھانکتا ہے اور جلوتوں کا نظارہ کرتا ہے وہ خلاؤں کے دیس میں بھورے پہاڑوں اور زرد ٹیلوں کے نیچے ـــــ دھوپ کے ٹکڑے میں سما جاتا ہے اور طلسم ہوش رُبا بن جاتا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

— بوڑھا برگد اب بھی ہر رات کم سن شجر کے ساتھ ایک پُراسرار کھیل کھیلتا رہتا ہے. لیکن اب صنوبر کا شجر رُت بدل رہا ہے. اس میں لمحہ لمحہ تبدیلی آتی جاتی ہے. بوڑھا برگد یہ تبدیلی محسوس کر رہا ہے. وہ خاموش ہے. اس نے اُسے کانچ کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے. پر دھوپ کا لمس کمسن شجر کے جسم وجاں میں ایک کہرام مچائے ہوئے ہے. وہ بلوری پتھروں کو توڑنا چاہتا ہے اور خلاؤں میں اڑنا چاہتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کی جڑیں ابھی نازک ہیں. تنے نازک ہیں. وہ بوڑھے برگد کے آسرے کے بغیر جی نہیں سکتا. اور بوڑھا برگد اس کے جسم پر رینگتا رہتا ہے — اور یہ ایک برگِ آوارہ — کم سن شجر کا رازدار، پیغام رساں دھوپ کے ٹکڑے کا "ونجلی ہاتھ میں لئے. اک سپیرا مست شباب دھوپ کے ٹکڑے کو اپنی پٹاری میں قید کرنے کی فکر میں، جانے کب سے ستاروں پر کمند ڈالتا رہا. اُسے ونجلی کے مست سُروں میں ڈھالتا رہا. ویران بستیوں میں، جاگتے ویرانوں میں — وہ اسے لئے پھرتا رہا. کم سن شجر کے گھونسلے میں بیٹھا من کا پنچھی پھڑ پھڑاتا رہتا — اور برگِ آوارہ — سیپیوں کا سوداگر — موتی کی لذت کے لئے مچلنے لگا. اس کے خون میں تحریک ابھری. طلسم ٹوٹا. آواز کا مدھم شور — آواز میں دب کے رہ گیا. دریا کا پانی فطرت میں سما گیا — دھوپ شمع بنی. شمع جلنے لگی، پگھلنے لگی. روز جلتی رہی — پگھلتی رہی — ایک سمجھوتہ ہوا تھا رازداری کا، بوڑھے برگد اور صنوبر کے کمسن شجر کے درمیان — ایک سمجھوتہ کیا برگِ آوارہ نے — اب دھوپ کا ٹکڑا اس کی آسیب زدہ چوکھٹ کے اندر بھی آنے لگا. رجنی گندھا کے باسی پھول کھلنے لگے. اور یہ تکوینی سلسلہ چلتا رہا.

دن کے اجالوں میں — اس بیچ بوڑھا برگد دھرتی پہ اُگی فصل کے زرد بکھرے چہروں کو اپنی فہم وفراست سے روز وشب میں غرق کرتا رہا. وہ جو صلیب پہ چڑھنے والے تھے. اُسے ماہتاب وکہکشاں کی بلندیاں دینے والے تھے — اُن میں اندھے اعتقاد کی دیواریں لرز رہی تھیں. بوڑھا برگد اپنے تیز دانتوں سے ریت چباتے چباتے صلیب کے پیاسوں کی پیاس بجھانے لگا. اس کا ہر برگ خنجر بنا. کچے رنگوں کے پیراہن سسکنے لگے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

آدھی ادھوری چاندنی اِک روگ بننے لگی۔ دوُر افق میں دھواں دھواں بادل اُڑنے لگے اور بوڑھا برگد ـــــ اپنے بے حس وجود کو آندھیوں سے ڈھانپنے لگا۔ سنگلاخ زمین پر غیر فرقہ وارانہ برادری ـــــ امن و آشتی ـــــ مربوط اقتصادیات اور قومی سربلندی کے بے رنگ قاصد ـــــ کاغذی گھوڑوں پر سفر کرنے لگے۔ اور بدظن ہوئے وہ گھوڑے جو عربی و ترُکی تھے۔ وقت بدلا، قدریں بدلیں ـــــ مندروں میں، مسجدوں میں، زمانے کی نیرنگیوں کے خُطبے پڑھے جانے لگے ـــــ اور اس کوری کتاب کے اوراق میں گُم ـــــ بوڑھے برگد کا سیاہ پیڑ رات کی تاریکیوں میں اپنے ذہن وُ دل کی تسکین کے لئے پُراسرار کھیل کھیلتا رہتا ہے صنوبر کے کم سن شجر کے ساتھ۔ جو اَب کنارہ کنارہ دوُر ہوا جاتا ہے۔ جس کے دل کا پنچھی اب ہر دھوُپ کے ٹکڑے کو دیکھ کر پھڑپھڑانے لگتا ہے، جو اَب دوُر پھیلی ہوئی، بکھری ہوئی ننگی دھوپ کو کھا جانا چاہتا ہے۔ کم سن شجر کے آنگن میں اب ہر روز دھوُپ کی کرنیں اُترتی ہیں اور اُسے اڑن کھٹولے پہ ہچکولے دیتی ہیں ـــــ اب غزنوی میں تڑپ تو ہے پر زُلفِ ایاز میں خم نہ رہا۔ فاصلہ بڑھنے لگا۔ فاصلہ بڑھتا گیا ـــــ سمجھوتہ ٹوٹنے لگا۔ سمجھوتہ جو ہوا تھا ـــــ رازداری کا، بوڑھے برگد کے سیاہ پیڑ اور صنوبر کے کم سن شجر کے بیچ۔ اور یوں کم سِن شجر لق ودق شہروں کی بھیڑ میں دھوپ کی کرنوں سے غسل کرتا رہا۔ اُس کی اِس روش سے بوڑھا برگد اپنے آپ کو بے آب و گیاہ ریگستان میں تنہا محسوس کرنے لگا ـــــ اس کی آنکھوں میں دھوپ کی کرنیں تیر بن کر چبھنے لگیں۔ وہ چاروں سمت پھیلے اندھیرے کی آگ میں جلنے لگا۔ آگ پھیلتی رہی۔ شعلے بھڑکتے رہے اور اس کی سوچ کے دریچے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ اس نے دیومالاؤں کے راکھشس کا روپ دھار لیا اور اپنے آہنی پنجوں سے کم سن شجر کو دبوچ لیا۔ برگ چھریاں بنے اور چھریاں اُس کے تن میں پیوست ہوگئیں۔ کم سِن شجر جو کم سنی کے داغ کو اپنی پیشانی سے مٹانے کی تگ ودو میں لگا تھا۔ جو اپنے آپ کو مضبوط سمجھنے لگا تھا، اس کی جڑوں سے لہو کی بوندیں رِسنے لگیں۔ لہو رِستا رہا اور شعلوں کو ٹھنڈا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ آگ ـــــ راکھ کا ڈھیر بن گئی ـــــ اور پھر راکھ ـــــ کمسن شجر کے قتل پر پچھتانے لگی۔ ہر قاتل کی طرح ـــــ بوڑھے برگد کی راتیں ویران ہوگئیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا رہنے لگا۔ اداسی اور کرب کی اندھی کھائیوں میں غرق ہونے لگا۔ وہ ٹوٹنے لگا، بکھرنے لگا ــــ وہ جو آہنی ارادوں کے مینار کی طرح اگا تھا ــــ ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ اس کا وہ پُراسرار کھیل جو اس کا کشکولِ آرزو بھرتا تھا، اب ماضی کی یاد بن چکا تھا اور یاد اسے تڑپا کے رکھ دیتی۔ وہ بھینی بھینی مہک جو اس کے لاشعور میں رچ بس گئی تھی اس کے ذہن و دل پر وجد طاری کر دیتی تھی وہ مہک ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اس مہک کو پھر مٹھی میں بند کرنے کی ناکام جدوجہد میں وہ خود لمحہ لمحہ ہوا میں تحلیل ہوتا گیا۔ اس کی درخشاں چھرگی زرد رنگوں میں جذب ہوتی گئی۔ پتے جھڑتے گئے، شاخیں ٹوٹتی گئیں ــــ اور ایک دن ــــ ریت کے صحرا میں کھڑا ویران، اداس، سوکھا، بے برگ برگد طوفان کی زد میں آگیا۔ وہ تیز آندھی میں اپنے وجود کو نہ سنبھال سکا۔ وہ گر پڑا ــــ وہ ختم ہو گیا ــــ ہمیشہ کے لئے ــــ اور تسکین کا سامان ہو گیا اندھے اعتقاد کی دیواریں توڑنے والوں کے لئے ــــ کچے رنگوں کے پیراہن، مُسکرانے لگے، گنگنانے لگے کہ شاید اب رُت بدلے گی ــــ اور لالہ کے پھول کھلیں گے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گہرے پانیوں کا دُکھ

میں کب سے اس گہری جھیل میں تیر رہا ہوں لیکن جھیل میں کوئی ہلچل نہیں۔ لہریں شانت ہیں، موجیں خاموش ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ لہریں اچھلیں اور بپھریں۔ طوفان آئے اور میں ڈوب جاؤں۔ مگر جھیل شانت ہے۔ خاموش ـــــــ بے حرکت۔

یہ جھیل صدیوں پہلے مچلی تھی۔ اس میں ہلچل پیدا ہوئی تھی، اس کی لہریں اچھلی تھیں مگر اس سمے جھیل میں تیرنے والا کوئی نہ تھا اور جو شخص اس جھیل میں اُترا تھا وہ تیرنا نہ جانتا تھا۔ بس کنارے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں سے شفاف پانی کو گدلا کیا کرتا تھا ـــــــ پر جھیل تو بہت گہری ہے۔ اس کی اوپری سطح کے ہلنے سے اندر ٹھہرے کنوارے جل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اور آہستہ آہستہ اس ٹھہرے ہوئے نرمل کومل، جل پر کائی اُگنے لگی۔ کائی نے جھیل کو گھیر لیا، اس کی سندرتا ماند پڑنے لگی۔ وہ مرجھانے لگی، آلودگی کا شکار ہونے لگی اور ایک لمبے عرصہ تک جھیل میں پاؤں پڑے رہنے سے اس شخص کے پاؤں گل سڑ گئے۔ اور پھر بے پاؤں کا یہ شخص حادثوں کا شکار ہو کر گھنیرے بادلوں میں تحلیل ہو گیا۔ گرد و غبار کی آندھی میں فنا ہو گیا اور یوں جھیل کی اوپری سطح کا ہلنا بھی بند ہو گیا۔ جھیل کے ساکن رہنے سے پانی پر کائی کی فصل پھیلنے لگی ـــــــ اور اب ـــــــ یہ جھیل کائی سے بھری پڑی ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اور میں ایک ماہر غوطہ خور کی طرح گہری شانت جھیل سے کائی نکالنے کی کوشش میں پانی کی تہہ تک غوطے لگا رہا ہوں اور جمی ہوئی کائی کو کھرچ رہا ہوں اور دھرتی کے منہ پر مار رہا ہوں تاکہ دھرتی کا منہ بند رہے اور وہ گندے شبد اپنی زبان سے نہ نکال سکے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں کائی کھرچتے کھرچتے میرے ناخن ہی نہ اتر جائیں۔ انگلیوں سے خون نہ رسنے لگے کیونکہ جھیل کی تہہ میں جمی کائی کے اندر پتھر کی ایک خوبصورت مورتی بھی پڑی ہوئی ہے۔ میں کائی میں پھنسی مورتی کو تخ بستہ پانی سے باہر نکالنا چاہتا ہوں اس کی کایا کو کھرچنا چاہتا ہوں۔ اس میں حرارت بھر دینا چاہتا ہوں۔ اسے پگھلانا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مورتی جذبات کو فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کی خواہشات کا پنچھی تو کھلے آسمانوں میں اڑنا چاہتا ہے مگر وہ اس کے پر کاٹ دینا چاہتی ہے۔ وہ جھیل سے باہر نکلنے پر رضامند نہیں ہے۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ ایسا نہیں ہونے دونگا، میں اُسے بے حسی کی چکی میں پسنے نہ دونگا۔ اسے منجمد اُداسی کے زہر سے حاملہ نہ ہونے دونگا۔ اسے یادوں کی دھند میں بھٹکنے نہ دونگا۔ میں اس کی سلگتی روح میں زندگی کے بیج بوؤنگا اور مالی بن کر اس کی روح کے گلشن کو سیراب کرونگا تاکہ گلاب مہکیں اور خوشبوئیں چاروں طرف پھیل جائیں۔ وہ مورتی رادھا کی ہم شکل ہے اور میری صورت کرشن سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ میری رادھا ہے اور میں اس کا کرشن کنہیا۔ میں اس کے لئے پربھم گیتا کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں جس میں ارجن کے لئے صرف یہ حکم تحریر ہوگا کہ وہ محبت کے چراغ جلائے تاکہ خدائے عشق کا دیدار ہوتا رہے اور عبادت جاری رہے اس سمے تک جب تک سرشٹی کا طلسم نہ ٹوٹے۔ لیکن وہ ہے کہ سرشٹی کا طلسم ٹوٹتے دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ کہتی ہے :

"دنیا کا یہ سمندر بہت گہرا ہے۔ یہاں آس کے جزیرے ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ یہاں کا اتہاس جسم کے ننگے پن سے شروع ہو کر تہذیب کے لباس تک جاتا ہے اور یہ تہذیب ایک جنگل ہے۔ مہذب آدم خوروں کا جنگل۔ یہاں سفید اور اجلے کیڑے درختوں کو چاٹ رہے ہیں۔ درختوں کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں وہ ننگے ہو رہے ہیں اور ہم سب بے بس ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔ بس زندگی کا بوجھ اٹھائے دھرتی میں دھنس رہے ہیں۔ ہم سب اپنے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

جسموں کی سُولیوں پر ٹنگے ہیں۔ اس کے باوجود تم پریم گیتا کی تخلیق کرنا چاہتے ہو۔ محبت کے چراغ جلانا چاہتے ہو، خدائے عشق کا دیدار کرنا چاہتے ہو۔"

"دیکھو رادھا، اپنے احساسات کی بھٹی میں اس قدر تیل نہ ڈالو کہ تمھاری ہستی جل کر راکھ ہو جائے۔ دنیا کی کوئی شے اپنی ذات میں بُری نہیں ہے۔ ہمارے بُرے کرموں سے وہ بُری ہو جاتی ہے۔ اس لئے بدی کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ محض اعتباری ہے۔ جبکہ زندگی ایک حقیقت کا نام ہے۔ اس سچ کو سمجھو۔ اس سے بھاگو مت۔ زندگی کائنات میں بکھرے ہوئے رنگ ہیں۔ زندگی محبت ہے۔ عشق ہے۔ لیکن تمھاری زندگی کی عمارت بالکل ویران پڑی ہے۔ کمرے اجاڑ ہیں۔ میں تمھارے دل کی کوری دیواروں پر زندگی کی تصویریں سجانا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں خوشیوں بھری مکمل زندگی دینا چاہتا ہوں اس لئے اپنے دل کا دروازہ مجھ پر بند نہ کرو۔"

"میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا ہے کرشن، جو گھنے رشتوں کے جنگل کو جاتا ہے۔ میں نے خواب بُننے چھوڑ دئے ہیں اور اپنے دامن سے پیار نام کی گرد جھٹک دی ہے۔ تم نہیں جانتے کرشن! بہت پہلے میں نے سرابوں کے پیچھے بھٹکتے ہوئے دل کے ساحل پر میں ایک گھروندا بنایا تھا۔ اس میں چاہت کا دیپ جلایا تھا پھر چپکے سے کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور میں نے اسے اندر بلا لیا تھا۔ میں اسے اپنے جسم کی چادر بنانا چاہتی تھی —— تم جانتے ہو عورت ایک بیل کی طرح ہوتی ہے جو چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے اسے ہر وقت ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اسے اپنا سہارا بنانا چاہتی تھی —— اپنی واحد پناہ گاہ —— لیکن وہ تو ندی کنارے کھڑا ایک ایسا پیڑ تھا جس کی جڑیں کھوکھلی تھیں۔ ہم دیر تک اندھیرے اجالے کا کھیل کھیلتے رہے۔ میں اس میں ہریالی لانے کی کوشش کرتی رہی اور وہ مجھے بانجھ بناتا رہا۔ وہ ایک ایسا بادل تھا جو گرج سکا نہ برس سکا۔ وہ شخص میری زندگی میں ایک لپکتے ہوئے کوندے کی طرح داخل ہوا اور میری روح کو جلا کر میرے اندر سے نکل گیا۔ میں اسے پکڑ بھی نہ سکی اور پھر میں جھیل میں ڈوب گئی۔ کائی سے بھری ہوئی جھیل میں —— میں یخ بستہ ہو گئی، میں نے آنسوؤں کی پونجی کو بے دریغ لٹایا لیکن کچھ نہ پایا۔ اس لئے تم جھیل کی تہہ میں امیدوں کے چراغ مت جلاؤ۔ مورتی کو پگھلانے کی کوشش چھوڑ دو کرشن۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

"رادھا! ہم سبھی محبت کی تمنّا کرتے ہیں۔ یہ ہماری پہلی فطری ضرورت ہے۔ ہمارے دل کی پہلی آرزو۔ اس لئے تم مجھے تیاگ کی دعوت نہ دو، میں تم سے محبت کرتا ہوں تم بھی مجھے چاہتی ہو لیکن اظہار نہیں کرتیں۔ یہ بات میں نے تمھارے جسم پر لکھی تحریر سے پڑھ لی ہے۔ تم نے اپنے جذبات کو اپنے وجود کے کمزور قلعے میں محصور کر لیا ہے۔ کیونکہ تم اس لمحے سے ڈرتی ہو جب جذبات کا بندھ ٹوٹ جائیگا اور تمھیں تنکے کی طرح بہالے جائیگا۔ لہٰذا اس جال سے باہر آجاؤ رادھا، جو تم نے خود ہی اپنے گِرد بُن رکھا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کرشن کہ میں تمھیں چاہتی ہوں لیکن تمھارے نزدیک محبت جسموں کے سماگم کا نام ہے جبکہ میرے نزدیک یہ ایک لافانی جذبہ ہے۔ ایک خوشبو ہے، روح کو معطر کرنے والی خوشبو ــــ محبت روحوں کے ملاپ کا نام ہے۔ کیونکہ ہم روح کی حالت میں ایک تھے اور جسموں سے بے نیاز تھے۔ سورج کی طرح چمکیلے اور جھرنوں کے پانیوں کی طرح صاف وشفاف۔ جب جسموں میں قید ہوگئے تو ہمیں حصوں میں بانٹ دیا گیا اور ہماری وحدت گم ہوگئی اس لئے آؤ جسموں کا بوجھ اُتار پھینکیں۔ خواہشوں کی زنجیر توڑ دیں۔ قید سے نکل بھاگیں اور اپنے اصل مقام کو پالیں۔"

"ہر انسان میں دو قسم کی روحیں ہوتی ہیں، رادھا! ۔ ایک فانی اور دوسری غیر فانی ــــ غیر فانی روح نفس کی خواہشات مٹا دینا چاہتی ہے لیکن فانی روح پیار اور لذّت کی رسیا ہوتی ہے میں بھی ایک فانی روح ہوں۔ میں تمھیں محبت کی لذت چکھانا چاہتا ہوں۔ جسموں کے سماگم سے جنت میں لے جانا چاہتا ہوں کیونکہ جسموں کا سماگم ہی مکتی کا وسیلہ ہے۔ عشقِ حقیقی کا پُل ہے۔ رادھا! تم اور میں صرف ایک ذات ہیں۔ اس سے الگ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ فقط آنکھوں کا دھوکا ہے۔"

"کرشن! تمھارے دل ودماغ کی آب وہوا معتدل نہیں ہے۔ تمھاری باتوں میں عقل سمجھ کا کوئی دخل دکھائی نہیں دیتا۔ تم محبت کو صرف اپنے پیمانے سے ہی ناپنا جانتے ہو۔"

"عشق کا مقام عقل سے بہت بلند ہے رادھا، بہت بلند ــــ اور محبت ترازو ہے نہ پیمانہ۔ یہ تو زندگی اور موت کے درمیان ایک خزانہ ہے جس کا حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ یہ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تو جذبوں کی دولت ہے، سرمایۂ حیات ہے۔ البتہ تمہارے رویّے کی شدت مجھے پسند نہیں۔ لگتا ہے کہ تم اپنے سوا کسی سے رشتہ پیدا کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ تم چاہت کا گھر سُونا ہی رکھنا چاہتی ہو۔ تم سُلگ سُلگ کر راکھ ہو جانا چاہتی ہو —— رادھا تم کیوں اپنی زندگی کو کربلا بنانے پر تُلی ہوئی ہو اور میں کب تک تمہارا مرثیہ پڑھتا رہوں گا۔ تم نہیں جانتی کہ یہ دنیا حساس لوگوں کے لئے جہنم ہے۔ اس لئے زندگی کے ایک ایک سانس کو خوشیاں بٹورنے کے لئے وقف کردو۔ مجھے تمہاری یہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زندگی پسند نہیں۔ تم اپنا سالم وجود سمیٹ لو اور میرے ساتھ چلو۔ میرا پیار کڑی دھوپ میں تمہارے لئے سایہ بن جائیگا۔ اور اندھیروں میں روشنی کا کام دیگا۔ تمہارے جسم کے غار میں بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ روشنی کا کہیں نام ونشان تک نہیں۔ تم اجازت دو تو اِس سرد اندھیرے غار میں آگ جلا کر تمہاری روح میں روشنی بھر دوں۔ دیکھو رادھا، انسان کے اندر جذبے توڑ پھوڑ تو کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن دل کا برتن خالی نہ رکھنا چاہئیے۔ چاہے اس میں غبار ہی کیوں نہ ہو۔ میں مانتا ہوں کہ آسمان گدلا ہے۔ زمین مٹیالی ہے اور سورج بادلوں کے دھوئیں میں اٹکا ہوا ہے۔ پھر بھی آؤ ہم تم ساتھ ساتھ چلیں جگنوؤں کو پکڑیں اور زندگی کے ایک ایک لمحے کو روشنی بخشیں۔"

"زندگی کے اس راستے میں اب مجھے کسی پیڑ کی ضرورت نہیں رہی کرشن! میں نے کب کا اپنے سائے میں جینا سیکھ لیا ہے۔ میں ایسی کالی رات ہوں جو کبھی روشنی کو جنم نہیں دے سکتی۔ اس لئے مجھے جگنو پکڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے دل کے دروازے کو اندر سے قفل لگا دیا ہے۔ میری بہار کب کی برف میں دب چکی ہے اور برف پگھلنے والی نہیں ہے۔ تم مورتی توڑنے کی کوشش چھوڑ دو۔ میں تو اس انتظار میں ہوں کرشن، کہ کب میری روح جسم کے کفن سے آزاد ہو جائے۔"

"رادھا! جسم روح کا کفن ہے نہ قبر۔ جسم سولی بھی نہیں ہے۔ یہ تو روح کا پیکر ہے۔ ایک خوبصورت لباس۔ جسم کی سیڑھی پر چڑھ کر ہی روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔ رادھا! عورت نے مرد کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ تنہا رہے۔ مرد اس کا رفیق ہے، سنگی ہے، ساتھی ہے، اس کا پورک ہے، اس کا ہم سفر ہے۔ اس لئے مجھ سے فرار مت چاہو۔ میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

تمھیں ہارنے والا نہیں ہوں ۔ میں سچے جذبوں کا سوداگر ہوں ۔ مجھ سے میرا سچ خرید لو۔
وقت برباد مت کرو ۔ وقت اور لہریں کسی کا انتظار نہیں کرتیں ۔"
"لیکن میں خود اپنے آپ کو ہارنا چاہتی ہوں ۔ اس میں تم کیا کر سکتے ہو ۔"

میری ساری کوششیں ناکام ہوگئیں ۔ میرا منزل پر پہنچنا محال ہوگیا ۔ بھلا کیلے کے چھلکوں پر چل کر بھی کوئی منزل پر پہنچ سکتا ہے ۔ اُس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش میں میں خود برف کی سِل بننے لگا ۔ اور آخر ایک دن پتھر کی وہ خوبصورت مورتی جو پل بھر کے لئے جھیل سے ابھری تھی ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کائی سے بھری جھیل میں ڈوب گئی ۔ وہ غائب ہوگئی ۔ میں گہری جھیل میں تیرتا رہا ۔ تہہ میں اسے تلاش کرتا رہا ۔ مگر جھیل میں کوئی ہلچل نہ ہوئی وہ خاموش رہی بے حرکت ۔ تھک ہار کر میں کائی سے بھری جھیل سے باہر آگیا ۔ اور کنارے پر بیٹھ گیا ۔ لیکن میرے پاؤں جھیل میں پڑے رہے ۔ اور جھیل کی مٹیالی سطح کو ہلاتے رہے ۔ کائی نے میرے پیروں پر پھپھوندی پھیلا دی ۔ میرے پاؤں بھی سڑ گئے ۔ پر وہ سندر مورتی جھیل سے پھر کبھی نہیں ابھری —— اس بات کو صدیاں بیت چکی ہیں ۔ لیکن میں بے پیروں کا شخص —— اب بھی کنارے پر بیٹھا اس کی جستجو میں جھیل کے اندر جھانکتا رہتا ہوں ۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کوئلہ بھئی نہ راکھ

رات کا پچھلا پہر ہے۔ چودھویں کا چاند بادلوں کا سینہ چیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ آم کے پیڑوں کی ڈالیوں پر آنے والے بوُر کی مہک میرے آس پاس پھیل رہی ہے۔ میرے آنگن میں کھڑا جامن کا پیڑ مسکرا رہا ہے۔ دوُر چودھریوں کے باغ میں کسی درخت پر بیٹھی کوئل اس طرح کوک رہی ہے جس طرح میرے دل میں درد کی لہریں اٹھ رہی ہیں ـــــ نیچے شاید کاکا جاگ اٹھا ہے ـــــ میرے چھوٹے بھائی کا لڑکا۔ بھتیجا بڑا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔ یہ کہیں میرا بلوُ تو نہیں۔ لیکن بلوُ ـــ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا بلوُ، پچھلے کئی جنم سے مجھ سے بچھڑا ہوا ہے اور آئندہ کئی جنم تک وہ مجھے نہیں مل سکے گا، اور اس جنم میں میری آنکھیں ترستی ہی رہیں گی ـــــ میں پہلو بدل کر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ چاند کے گولے کو دوُر دھرتی کے اندھے کنوئیں میں ڈوبتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ اندھیرے میں آنکھیں بند کر کے آتما کو پرم آتما کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لیکن میرا دل بہت ضدی ہے بالکل میرے بھائی کے کاکے کی طرح۔ جب بھی اسے سمجھاؤ یہ اور زیادہ مچلنے لگتا ہے۔ بھلا اسے کون سمجھائے کہ گزرے ہوئے ایام میں کچھ بھی نہیں رکھا۔

صبح ہونے ہی والی ہے۔ میں یادوں کا منوں بوجھ اٹھائے بھاری قدموں سے اٹھونگی اور اشنان کرونگی۔ صبح سویرے تازہ پھولوں کو رنگین ڈلیا میں سجا کر اور جسم کو سفید ساڑھی کا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کفن پہنا کر میں شیوجی کے مندر کی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں چوموں گی۔ پھولوں کی ڈلیا شولنگ پر چڑھاؤں گی۔ گیلے بالوں سے ٹپک رہی آگ کی چنگاریوں سے جوت جگاؤنگی اور پھر مندر کے فرش پر اس طرح گر پڑونگی جیسے کوئی جوگی کا بت صدیوں سے شانتی اور مکتی کے لئے سمادھی لگا کے بیٹھا ہو۔ لیکن میرے دل میں شانتی نہیں۔ میں گیلی لکڑی کی طرح ہمیشہ سلگتی رہی ہوں اور آخر تک سلگتی ہی رہوں گی۔ میرے من کو کوئی پوجا تسلی نہیں دیتی۔ کوئی چیز میرے ننگے زخموں کا مرہم نہیں بن سکتی مجھے نجات کی امید نہیں لیکن زندہ رہنے کے لئے بھی کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔

چناب کی لہریں اسی طرح ہیں۔ صرف میں بدل گئی ہوں۔ دیوتاؤں کے مقابلے میں انسان کی زندگی کتنی کم ہوتی ہے۔ لیکن میری زندگی کتنی طویل ہوگئی ہے۔ وقت کتنا لمبا ہوگیا ہے۔ جیسے یہ صدیوں کی بات ہو۔ لیکن مجھے سب کچھ یاد ہے، میں یادوں کی گٹھری کھول کر بیٹھ گئی ہوں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری روح میرے جسم سے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ لہو، میری رگوں میں ابلنے لگا تھا میرا وجود مجھے ایک بوجھ محسوس ہونے لگا تھا —— میں روزانہ شام کی گپھا میں گرتے سورج کو دیکھ کر اپنی بھینسیں لئے گھر پہنچتی اور اس دن بھی گھر ہی پلٹ رہی تھی کہ قریبی گاؤں کا گوتم مجھے ملا —— مندر کے پیپل کی طرح بلند، تازہ، ستھرا اور خوبرو۔ پرکشش آنکھیں —— مجھے کھینچ کر لے گئیں۔ میں نے پیپل کو پیار کا دھاگہ باندھ دیا۔ ہماری شادی کی بات ہونے لگی۔ ماں مجھے چولھے کے آداب سکھانے لگی۔ میں روز آٹا گوندھتی، پیڑے بناتی، پیڑے درست کر کے توے پر پھلکے ڈالتی۔ گول پھلکا نہ پکنے پر ماں میرے ہاتھوں پر چپٹا مارتی۔ لیکن میرے دل میں عشق کا آٹا گندھتا رہتا، پیار کے پھلکے پکتے رہتے۔ گول گول، پیارے پیارے۔ جب آٹا ختم ہوجاتا تو ماں آگ بجھا ڈالتی اور توا الٹا کر دیتی۔ توے پر آسمانی تاروں کی مانند آگ کے تارے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے۔ ماں کہتی یہ جگنوؤں کی بارات ہے لیکن میری بارات کبھی نہیں چڑھی۔

میرے خواب ریزہ ریزہ ہوچکے تھے۔ میں برف کی طرح ٹھنڈی یخ ہوگئی تھی۔ خون میری رگوں میں جم گیا تھا۔ اس شوجی کے مندر میں ہی اس کالے شیش ناگ نے میرے وجود کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گہرے سمندر میں زور سے پھُنکار ماری تھی اور میرا پورا جسم لرز گیا تھا ـــــ میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکی تھی۔ میرا گوتم ـــــ میرے والدین ـــــ میرے رشتہ دار ـــــ سب وقت کی آندھی میں تنکوں کی طرح بکھر گئے۔ جس طرف نگاہ جاتی، خون ہی خون، آگ اور دھواں، چیخیں ہی چیخیں ـــــ دوڑو ـــــ بھاگو ـــــ مجھے نہ مارو ـــــ رحم کرو ـــــ بچاؤ ـــــ بچاؤ ـــــ شور و غل اور انہی ہنگاموں میں وہ کالا شیش ناگ مجھے راجہ رسالو کے شہر لے آیا ـــــ "لونا" کے شہر ـــــ پورن کی بستی ـــــ پورن نگر میں۔ وہ روز پھنکاریں مارتا اور میرے برف جیسے بدن کو پگھلانے کی کوشش کرتا۔ اس کے پھَن کی چربی پگھل پگھل کر میرے ننگے جسم میں موم گھولتی۔ میں روز اس کا زہر پیتی۔ اس زہر کا میرے اندر ایک گولا بنتا رہا۔ میری ہڈیاں، پسلیاں دُکھتی رہیں اور میرا وجود ایک کچا پھوڑا بن گیا۔ مجھے ایک عجیب سا درد محسوس ہوتا ـــــ ایک ایسا درد جو بتانا بھی چاہتی، تو بتا نہ سکتی تھی۔ پھوڑا پکتا رہا ـــــ پھوڑا پھوٹ گیا۔ گولہ توپ کے منہ سے باہر نکل آیا اور میرے سینے سے چمٹ گیا۔ میرے برف سے بدن میں گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے سینے کے دو پتھر پگھل گئے۔ ان میں سے دودھ کی دھاریں بہہ نکلیں اور میں نے ایک ماں کا روپ دھار لیا ـــــ ببلو کی ماں کا ـــــ اب ببلو ہی میرے لئے سب کچھ تھا۔ میری ماں، میرا باپ، میرا گوتم، میرا بھائی ـــــ پورن کی بستی میں میرا دل لگنے لگا تھا۔ میں ببلو کو نہلاتی، کپڑے پہناتی، اس کے بالوں میں کنگھا کرتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے بال میرے پریشان خیال ہوں، جنھیں میرے ذہن کے ناخن کھرُچ رہے ہوں۔

وقت کسی پہاڑی پگڈنڈی کا مسافر، تھک کر چوُر ہو گیا تھا۔ سمندر کی لہریں پھر پُرسکون ہو گئی تھیں۔ چیخیں، بادلوں کو چیر کر رحم کے دیوتا کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ آسمان پر چیلیں اڑنا بند ہو گئی تھیں ـــــ مہاجروں کے کیمپ لگا دئے گئے تھے۔ اپنے جھُنڈ سے بچھڑی ہوئی کونجیں برآمد کی جانے لگی تھیں ـــــ پورن کی بستی میں بھی تلاشیاں ہونے لگیں اور ببلو کی ماں بھی برآمد کر لی گئی۔ شیش ناگ کی سنپولیوں کے آگے ایک نہ چلی۔ میں واپس اپنے گاؤں آ چکی تھی۔ گاؤں کے چاروں طرف کھڑی فصلیں مسکرا رہی تھیں جیسے سونے کی بالیاں الھڑ دوشیزاؤں کے کانوں میں ساز بجا رہی ہوں۔ ندی کی موجیں، آم کے درخت، گھر کے آنگن میں اُگا جامن

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کا پیڑ، سب کچھ موجود تھا ـــــ صرف باپ اور بڑے بھائی کی استھیاں آگ اور خون کے طوفان میں بہہ گئی تھیں۔ ماں نے مجھے سینے سے لگایا۔ دل کا اُبال دونوں کی آنکھوں سے جاری ہو گیا ـــــ پھر ایک دن قریبی گاؤں کا گوتم بھی مجھے مل گیا۔ لیکن کہتے ہیں ـــــ "خدا تو بندوں کو معاف کر دیتا ہے لیکن بندہ معاف نہیں کرتا ـــ" میرے کپل وستو کے گوتم نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا۔ میرے چاند کی دھرتی بھی بنجر ہی نکلی۔ اب اس کی چاندنی اچھوت ہو گئی تھی۔

وقت ایک ایسے جنگل کی مانند میرے سامنے پھیلا ہوا تھا، جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھیں تھک چکی تھیں۔ میں روز شوجی کے مندر میں جاتی اور خوب جی بھر کے روتی۔ مجھے شوجی کی مورتی ایک مکھوٹا دکھائی دیتی۔ پیپل کا درخت میری تقدیر پر ہنستا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے رشتہ داروں کی نظر میں میرا جرم کھٹکنے لگا۔ انھیں میرا سانپ کے بچے کو دودھ پلانا زہر لگتا تھا۔ وہ میری ممتا کو یتیم بنانے کے لئے سوچ بچار کرنے لگے تاکہ میرے بدن پر سرخ رنگ کے کپڑے پہنا کر مجھے کسی اور سانپ کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ مجھے ایک بار پھر آسمان پر چیلیں ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ میں گھر سے بھاگ گئی اور رفیوجی کیمپ میں آ گئی۔ وہاں مجھے میرے درد کو سمجھنے والی ایک دیوی مل گئی۔ میں نے ببلو کو اسکی گود میں دیدیا اور کہا:

"ماسی! میرا چھوٹا بھائی اور دوسرے رشتہ دار اسے مارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سانپ کا بچہ ہے۔ لیکن ماسی، یہ چاہے سانپ کا بچہ ہے یا انسان کا، پیدا تو میری کوکھ سے ہوا ہے۔ میں کیسے اپنے دل کو پتھر بناؤں۔ تو اسے بچالے۔ ببلو کو ان کی بستی میں لے جا اور کسی خالی آنگن میں پھینک دے۔ ورنہ میرے اپنے ہی اس معصوم کو قتل کر ڈالیں گے۔"

اور اس طرح میرا ببلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں آگ کے شعلوں سے بھری ہوئی نفرت کی بھٹی میں جل بھن گئی۔ میں پھر برف کی سل بن گئی اور پھر کسی ناگ دیوتا کے گلے باندھ دی گئی۔ برف کی سل کو پھر ایک بار پگھلانے کی کوشش ہونے لگی۔ پھنکاریں پھر سنائی دینے لگیں لیکن برف کی سل نہیں پگھل سکی۔ موم سل پر گرتے ہی جم جاتا۔ اسی طرح

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

کچھ دنوں ہوتا رہا اور پھر ناگ دیوتا میں برف پگھلانے کی قوت ہی ختم ہوگئی۔ موم گرنا بند ہوگیا۔ ناگ دیوتا کی پھنکاریں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئیں۔

ایک بار پھر میرے اِرد گرِد دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ میری راہیں کانٹوں سے بھر گئیں۔ پاؤں زخمی ہو گئے اور آسمان پر پھر چیلیں اڑنے لگیں۔ اور میں ایک زخمی کونج ـــــ پھر اپنے ماں باپ کے صحن میں گر پڑی۔ میرا دُکھ میری ماں کا روگ بن گیا اور دکھوں کی ڈائن میری ماں کا کلیجہ نکال کر لے گئی۔ اور مجھے اُسی گھر میں ہمیشہ کے لئے اجنبی بنا گئی جہاں میں کبھی پیدا ہوئی تھی، جہاں سبھی کچھ میرا تھا۔ لیکن میرا تیرا کہنے سے نہیں ہوتا، یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ یہاں کسی کا کچھ نہیں، خاص طور پر میرا، میرا ببلو، میرا گوتم ـــــــ کس کا ببلو؟ ـــ کس کا گوتم؟ ـــ لیکن زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو رہتی ہے اور میری یادیں میرا سہارا ہیں۔ ان یادوں کے تیل نے ہی شاید میری بے جان زندگی کا چراغ جلائے رکھا ہے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میری چادر، میرے پیر

میرے پاس ایک چادر ہے۔ پھٹی پرانی، تار تار ـــــ میں اسے پیوند لگا کر جوڑتا رہتا ہوں تاکہ میری عریانی کی پردہ پوشی ہو سکے۔ اس چادر میں میرا گزارہ نہیں ہوتا ـــــ جب بھی میں اسے سر پر لیتا ہوں، میرے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ کھلا رہ جاتا ہے۔ پیر ڈھکتا ہوں تو سر ننگا رہتا ہے اور سر ڈھکنے کی کوشش کرتا ہوں تو پاؤں چھپ نہیں پاتے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ سر اور پیر انسانی وجود کے اہم حصے ہیں اور کوئی انسان بھی انھیں جسم سے الگ کر کے جی نہیں سکتا۔ اور اس پر میرا چھوٹا سا خاندان، میری کمزور سی گرہستی ـــــ میرا پریوار۔ میری بیوی۔ میرے بچے ـــــ میرے وجود کے حصے ـــــ ان سب کی چھوٹی چھوٹی حسرتیں ہیں، خواہشیں ہیں ـــــ یہ سب تمناؤں کے پھندے میں پھنسے رہتے ہیں اور مجھے بھی آرزوؤں کی سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں ـــــ اور میرا پاگل پن یہ کہ خواہشوں کے صحرا میں گم ان روحوں کو اپنی چادر میں چھپانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اپنی "بُکّل" میں ڈھانپنے کا جتن جاری رکھتا ہوں۔ مگر میری یہ چادر تو مجھے ہی ٹھیک طرح ڈھانپ نہیں سکتی۔ انھیں کیا چھپائے گی ـــــ حالات کی اسی کھینچا تانی میں میری چادر اور پھٹتی رہتی ہے اور میں احساس کے منوں بھاری بوجھ نیچے دب کے رہ جاتا

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہوں۔ احساس .....بڑی تیز چھری ہے۔ تیز اور نوک دار .... یہ انسانی ضمیر کو......دل ودماغ کو چیرتی رہتی ہے ......

میں سترہ سال کا تھا کہ میرے اندر ضمیر نام کے ایک پودے نے سر ابھارا۔ تبھی مجھے زنجیر سے جکڑ کر ایک کھونٹے سے باندھ دیا گیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ ننھا پودا ایک تناور درخت بن گیا ۔ اور اس درخت کی شاخیں، پتے آوازوں کے زخم کھا کھا کر بکھرنے لگے ____

" یہ پیسے بہت کم ہیں۔ ان سے گھر کا گزارا نہیں ہوتا اور ان پر تیرے تین تین کھانے والے بیٹے۔ تم الگ ہو جاؤ......"

یہ الفاظ میری ماں کے ہیں۔ جس کے دو اور کنوارے کماؤ بیٹے بھی ہیں۔ مگر میرے وجود کے حصے سب کو چبھتے رہتے ہیں ____

" ماں! تو میری قرضدار ہے۔ تو مجھے پوری زندگی نہ دے سکتی تھی تو پیدا ہی کیوں کیا تھا!"____

" بکواس بند کر اور بھاگ جا یہاں سے ____ اپنی غلاظت سمیٹ کر ____ میں نے دوسروں کے بارے میں بھی سوچنا ہے ____ کب تک میں تم پر ہی کفن ڈالتی رہوں؟"

لوگ سچ ہی کہتے ہوں گے: " مانواں ٹھنڈیاں چھانواں " ____ مگر شاید ماں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ یہ سب سوچ کا فرق ہے۔ خیالات کا تضاد ہے ____ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لئے پوری دنیا ہوتی ہے مگر ایسی دنیا کسی کے پاس نہیں ہوتی جہاں ہم سب سما سکیں ____

اور ہم الگ الگ ہو گئے ____ میں زندگی کے تجسس میں خواہشوں کے تعاقب میں دوڑنے لگا اور میری پوری کائنات روٹی کے چند ٹکڑوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ قید ہو کر رہ گئی۔

" عثمان کو آج پھر بخار آ رہا ہے۔ یہ روز روز کا بخار ٹھیک نہیں ____ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔"

" ابھی کچھ دن پہلے تو ڈاکٹر کول کو دکھایا تھا۔ پچاس روپے فیس دی تھی۔ دوائی پر بھی چالیس روپے خرچ کئے تھے ____ اب بار بار اتنے پیسے کہاں سے لاؤں"۔ ____ تین مہینے سے شبنم کی سکول کی فیس نہیں دی ____ ارشی کے پاس فراک نہیں ہے ____ منّے کے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

دودھ کا خرچ ـــــ ہر چیز کو جیسے آگ لگی ہوئی ہے ـــــ کچھ بھی تو ہاتھ نہیں آتا، کیا کروں۔ کہاں جاؤں ـــــ خود میری چھاتی میں درد ہوتا رہتا ہے ـــــ اب تمھیں بتاؤ کہاں سے لاؤں میں اتنے پیسے ؟"

"یہ تو بچے پیدا کرنے سے پہلے سوچنا تھا۔ تب تو آگ لگی ہوتی ہے نا۔"

"چلو چھوڑو ـــــ زیادہ بک بک نہ کرو ـــــ ساری تنخواہ گھر میں ہی تو خرچ ہوتی ہے۔ میں کون سی عیاشی کرتا ہوں۔ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی چار پانچ گھنٹے اوور ٹائم بھی کرتا ہوں۔ وہ پیسے بھی تو گھر کی ضرورتیں ہی کھا جاتی ہیں۔ اخباروں، رسالوں میں چھپنے کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ بھی تو تمھیں ہی تھما دیتا ہوں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے جو ملتا ہے وہ بھی تم ہی سنبھالتی ہو ـــــ اب تمھیں بتاؤ میں اپنا پیٹ تو کاٹ کر پھینک نہیں سکتا۔"

"منّے کو میعادی بخار ہے شاید ـــــ پندرہ دن ہو گئے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

"تو میں کیا کروں ؟"

"کیوں ـــــ آپ کو بچوں کی کوئی فکر نہیں ! یہ سب میری ہی سردردی ہے ؟"

"فکر ایک دن کا ہوتا ہے یا دو دن کا ـــــ مگر میں تو فکروں کے جنگل میں بھٹکتا ہوا راہی ہوں۔ ان فکروں نے تو مجھ سے میرا اپنا پن بھی چھین لیا ہے۔"

"یہ لیں میرے کانوں کی بالیاں ـــــ بس یہی بچی ہیں اب تو، انھیں بیچ باچ کر منّے کی دوائی لے آئیں ـــــ" بالیاں میرے ہاتھ پر رکھتی ہوئی وہ بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے پہاڑی چشموں کی طرح ابل رہے تھے۔

"نہ رو بیگم ، یہاں اداس زرد چہروں پر لکھی زندگی کی کہانیاں کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ بے بس فرشتوں اور اداس روحوں کی بستی ہے۔ یہاں مسکاتے ہیں تو صرف شیطان۔ یہاں سب اپنی اپنی بانسری پر اپنا اپنا راگ الاپتے ہیں۔ یہاں تیری بات کون سنے گا بیگم ـــــ ؟ کبھی میں نے بھی خواب دیکھے تھے۔ حسین خواب ـــــ لیکن سپنوں کی سیڑھی پر چڑھ کر چاند تارے توڑے نہیں جا سکتے۔ اور چور دروازے میں پھلانگ نہیں سکتا۔"

"لیکن گلزار، جینا بہت مشکل ہے بھوکے رہ کے۔ ننگے رہ کے، ایک ایک چیز کے لئے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ترس ترس کے جینا بہت کٹھن ہے گلزار، بہت کٹھن۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بیگم! لیکن میں بے بس ہوں۔ میں سائے نہیں پکڑ سکتا۔ میں پرچھائیوں کا تعاقب کرتے کرتے تھک گیا ہوں بیگم۔ میں تو سُکھ کے موسم کا راہی تھا لیکن مرے چاروں طرف دکھ کیسے اُگ آئے۔ میں تمہیں بہت دیتا اگر میرے پاس کچھ ہوتا۔ اور دنیا سے میں کچھ مانگ نہیں سکتا۔ کیونکہ دنیا کے پاس مجھے دینے لائق کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لئے آؤ ہم خود ہی اپنا نرک بھوگیں۔ اور سورگ کی آس چھوڑ دیں۔ خواہشوں کے کھلونے توڑ ڈالیں کیونکہ ٹوٹنا ہی کھلونوں کا مقدر ہے ——"

"لیکن آتے جاتے سانسوں کے ساتھ خواہشوں کا رشتہ جڑا ہوا ہے گلزار! تم ہمارے سانسوں کی ڈوری کاٹ دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں بیگم! آمدنی کے سر سہرا ہوتا ہے۔ اور میری آمدنی بس اتنی ہی ہے کہ شبنم چاٹے پیاس نہیں بجھتی۔"

کئی بار مجھے خیال آتا کہ گھر گھرہستی کے پنجرے سے نکل کر کھلے آسمان کی طرف پرواز کر جاؤں۔ لیکن کھلے آسمانوں میں بھی کتنی دیر تک اڑا جا سکتا ہے۔ اوپر جانے والی ہر شے آخر کار دھرتی پر ہی آ گرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے آنکھیں چرا کر میں کہاں جا سکتا ہوں۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ اندھی گپھائیں اور بالآخر گھر کی چاردیواری ہی روشنی کا منبع معلوم ہوتی ہے۔ اور میں اسی روشنی کے جگنو پکڑنے کے لئے گھر کی طرف پلٹ آتا ہوں۔ لیکن روشنی ہاتھ نہیں آتی۔ یہ غربت بڑی ظالم شے ہے۔ یہ میری چادر پر لگے شرافت کے بخیے ادھیڑ دیتی ہے اور جیتے جی موت کے کنوئیں میں دھکیل دیتی ہے۔

اور پھر —— دکھوں کے ایک لمبے سفر اور عذاب کی بے شمار جلتی پگھلتی راتیں بتانے کے بعد شاید نو گرہوں کو مجھ پر رحم آگیا۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے —— اور میری چادر بدلانے کا فیصلہ کر لیا —— میرے ماتھے پر لکیریں اُگ آئیں، جگ مگ کرتی لکیریں۔ ہنستی مسکراتی چاندی رنگی لکیریں۔

میں نے فرہاد کا روپ دھارا اور دودھ کی نہر کا رُخ اپنے گھر کی طرف کر لیا۔ دودھ قطرہ قطرہ میرے تن من کو سیراب کرنے لگا۔ سورج کی کرنیں میرے سیلن کھائے مکان میں بھی آنے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لگیں بسبز موسم کی گلنار دھوپ میرے آنگن کو لشکانے لگی ۔ نرگسی، کاسنی، کیسری، چمپئی، گلابی اور آسمانی پھولوں کی بہار آگئی ۔ کونپلیں سر ابھارنے لگیں ۔ غنچے مہکنے لگے ۔ میں نے میلی کچیلی چادر کو لپیٹا اور پرکھوں کی بخشی ہوئی کال کوٹھری میں پھینک دیا ۔ اور کوٹھری کی بیرونی دیواروں کو سفیدی سے چمکا دیا ۔ یوں لگا گویا میرے ذہن پر سے صدیوں کا بوجھ اتر گیا ہو ۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ۔ میں نے بازار سے ایک نئی چادر خریدی ۔ بہت لمبی اور چوڑی ۔ اتنی لمبی چوڑی کہ میں اور میرا پورا خاندان بآسانی اس میں سما گئے ۔

ہم جب بھی اسے اوڑھ کر سونے لگتے تو نہ صرف یہ کہ وہ ہمیں پوری طرح ڈھک لیتی بلکہ چادر کا کافی حصہ بچ بھی رہتا ۔ کوئی کھینچا تانی نہ رہی ۔ ہم سب آرام کی نیند سونے لگے ۔ بیوی بچے سب خوش ہو گئے ۔ بیگم کی خالی خالی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگے ۔ پلکوں کی جھالر جھل مل کرنے لگی ۔ اور کرتی بھی کیوں نہ ؟ اس کی تمنائیں سہاگن ہوئی تھیں اس کی ہر صبح سج دھج کر نکلنے لگی تھی ہر شام خوشبوؤں سے مہکنے لگی ۔ چوڑیوں میں خوشیاں چھنکنے لگیں ۔ گھر میں ہریالی گانے لگی ۔ میرے بچے نئے موسموں سے گلے ملنے لگے ۔ بسنت بہار کی رُت ہمارا سنگار کرنے لگی ۔ لیکن آس پڑوس کی آنکھیں ہمیں دیکھ کر پھٹنے لگیں اور زبانیں دیواروں کے کان پھاڑنے لگیں ۔

" بھئی جمال دین ! سنا ہے ٹاٹ کو مخمل کے پیوند لگنے لگے ہیں ۔"

" ہاں یار ! بیڈیوں میں بھی جھولا جھولنے کا شوق پیدا ہوا ہے ۔"

ہم نے اپنی دیواروں پر لوہے کی چادریں چڑھالیں اور کانوں کو پلستر کرالئے کہ کہیں آوازیں ہمارے عیش و آرام میں مخل نہ ہوں اور چُلّو بھر بھر ساگر پینا شروع کر دیا ۔

" جناب عالی ! یہ سڑک کے کام کا کمیشن ہے ۔ باقی سب لوگوں کا کمیشن دیدیا گیا ہے ۔ بس اب یہ آپ ہی کا حصہ ہے ۔"

" کیا فرمایا جناب ! سکول بلڈنگ کا کام ۔ وہ بھی پورا ہو گیا ۔ بس بل بنانا باقی ہے ۔ میں خود ہی دو چار دن تک اوپر سے پاس کرا کر لے آؤں گا ۔ آپ فکر نہ کریں ۔ لیکن کمیشن اس میں کم ہے جناب بلڈنگ کا معاملہ ہے نا ۔ سڑک کے کام میں ٹھیکیدار کھلا پیسہ کماتے ہیں ۔ اسی لئے اپنا بھی بھرپور کمیشن ہوتا ہے ۔"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

" جناب! وہ سیمنٹ کے دو ٹرکوں کا معاملہ چانن شاہ سے پٹ گیا تھا۔ یہ حضور کا حصہ ہے پانچ ہزار روپے۔"

" جناب یہ کام کے بدلے اناج کی سکیم بہت بڑھیا سکیم ہے۔ مزدوروں میں تین ہزار کوئنٹل غلّہ تقسیم ہو گیا ہے۔ علاقے بھر کے کھڑپنچ بھی نہال ہو گئے ہیں۔ ایم ایل اے صاحب بھی خوش ہیں۔ پنچ، سرپنچ سب خوش، سب نہال اور چھ سو کوئنٹل غلّہ بچ بھی گیا۔ حکم ہو تو منگو شاہ سے بات کی جائے؟"

"کیا فرمایا جناب؟ حساب کتاب! وہ سب ٹھاک ٹھیک ہے۔ کاغذات مکمل ہیں۔ فکر کی کوئی بات ہی نہیں حضور!"

—— میں رنگوں کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ میری سوچ کا جسم کھوکھلا ہوتا گیا تخلیقی چشمے خشک ہوتے چلے گئے۔ میرے ہاتھ ادب تراشی کا فن بھول گئے۔ الماریوں میں سجی کتابیں حیرت و حسرت سے مجھے تکنے لگیں اور میں ایک نئی سوچ کے اندھے کنویں میں ڈوبنے لگا —— سوچ —— اپنے اندر کے فنکار کو قتل ہونے سے بچانے کی سوچ۔ اپنے ضمیر کے مرجھائے ہوئے پودے کو ہرا بھرا دیکھنے کی سوچ ——

اور پھر یوں ہوا کہ میری نئی چادر بھی میرے خاندان کے لیے تنگ ہونے لگی۔ میرا گزارہ اس میں بھی مشکل ہو گیا اور ایک بار پھر میں اپنے وجود کے ٹکڑوں کو اس چادر میں سمیٹنے کا جتن کرنے لگا۔ لیکن میں کیا کرتا کہ میرے جسم کے سبھی اعضاء لمبے ہو گئے تھے۔ میرے خاندان والوں کے پانوں لمبے اور سر چوڑے ہو گئے تھے۔ اتنے لمبے چوڑے کہ چادر انھیں ڈھانپنے میں ناکام ہونے لگی۔ اور بیگم ایک بار پھر ایک نئی چادر کے لئے ضد کرنے لگی۔ لیکن میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیوں نہ پیروں کی زائد لمبائی کاٹ دی جائے۔ چوڑے سر نارمل سائز کے کر دئے جائیں۔ لیکن یہ سب کیسے کیا جائے۔ میری روحیں —— میرے جسم کے ٹکڑے تو اپنے ہاتھ پاؤں کو چھونے بھی نہ دے رہے تھے۔

میں فکروں کا بنجارہ پھر سے خوابوں کے غیر آباد جزیروں میں بھٹکنے لگا۔ میرے اندر دکھ پھر سے سر ابھارنے لگے اور ضمیر کا مرجھایا کمھلایا پودا تند و تیز طوفانوں میں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

گھر گیا۔ پتے شاخوں سے اور شاخیں تنے سے الگ ہونے لگیں۔
"آخر یہ سب کس لئے؟ اپنی قبر کے عذاب کے لئے ـــــ میری بیوی، میرے بچے میری روحیں ـــــ کوئی بھی میرے غموں کا شریک نہ ہوگا۔ میرے دکھوں کا ساجھی نہ ہوگا، اور جس راستے ہم چل نکلے ہیں اس کی کوئی انتہا بھی تو نہیں ـــــ کوئی منزل بھی تو نہیں ـــــ اور بے منزل راستے تباہی کے گہرے گڑھوں کی جانب ہی لے کے جاتے ہیں" ـــــ میں سوچتا رہا اور میری پیشانی پر گم شدہ آنکھوں کا نور پھر سے چمکنے لگا اور میں ان راستوں سے منحرف ہو کے واپس ہونے لگا جن پر چلتا چلتا میں اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہو گیا تھا ـــــ میں پیچھے کی طرف دوڑنے لگا ـــــ ـــــ مجھے دور سے اپنا سیلن والا مکان آوازیں دینے لگا۔ اس میں ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی لَو پھر سے تیز ہونے لگی جسے پکڑتے ہوئے کبھی میرے ہاتھ جل گئے تھے۔ آج وہی روشنی مجھے پیاری لگ رہی تھی۔ میں گھر پہنچا اور اپنے اجداد کی بخشی ہوئی کال کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ زنگ خوردہ صندوق میں سے اپنی وہی پھٹی پرانی، پیوند لگی چادر نکالی ـــــ اسے کھولا اور بڑے ہی سکون سے گچھ مچھ ہو کر اسے اوڑھ کر لیٹ گیا اور نہ جانے کتنے عرصے بعد ـــــ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

اشتہاروں والی حویلی

اس حویلی کا نام اکرام منزل تھا۔ اس محلہ کی تین چار بڑی حویلیوں میں سے ایک حویلی ـــــ اکرام منزل۔ مستری اکرام کھوکھر کی حویلی ـــــ محنت، مزدوری، عقل، سوجھ اور دُوراندیشی کے چُونے گارے سے بنی ہوئی یہ حویلی، آج بھی مستری اکرام کھوکھر کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے 'مستری اکرام کھوکھر کو' ـــــ اپنے زمانے کی ایک مشہور ہستی تھے ـــــ لمبا قد، چھریرا بدن، گورا چہرہ، موبلائل اور گریس سے بھری سیاہ ڈانگری میں بھی سورج کی طرح چمکتا رہتا، چوڑے ہاتھوں میں بیمار گیئر بکس، گراریاں نٹ بولٹ، پمپ، سلنڈر صحت یاب ہوکر کھیلنے لگتے۔ روتا انجن ہنسنے لگتا۔ شب و روز کی محنت نے گاڑیوں کے مستری اکرام کھوکھر کو دلاور بس سروس کا حصہ دار بنا دیا تھا ـــــ بڑے شریف، ملن سار، سماجی قدروں کے پیارے، غیرت اور عزت کے رکھوالے، ہر ایک کے ماں جائے، دنیاداری کو سمجھنے والے، اچھی اور بُری آنکھ کو پہچاننے والے ـــــ۔ تین لڑکیاں ہوئیں، پر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اکرام کھوکھر نے انکی شادی کردی تاکہ ان کی عزت کی چادر کہیں داغدار نہ ہوجائے ـــــ اکرام منزل میں دو لڑکے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بھی نازل ہوئے۔ اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر۔ پڑھنے لکھنے کی تمام سہولتیں، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ ہر طرح کی ناز برداریاں۔ پر دونوں تیرھویں کے چاند نکلے کھوکھر خاندان اور اکرام منزل پر میلی چاندنی چھٹکنے والے۔

اسلام کھوکھر، کچا ڈرائیور، پکا شرابی۔ حلیمہ کا خاوند۔ تین بچوں کا باپ اور تنخواہ نو ہو ہر رات کی کالک شراب کی بوتل میں گھل جاتی۔ بوتل، اسلام کھوکھر کے حلق سے اترتے ہی پیٹ میں چلی جاتی اور ناچنے لگتی۔ ناچتا جسم گانے لگتا، گاتا شریر اڑنے لگتا۔ پھر اڑان اسلام کھوکھر کو آسمان پر لے جاتی۔ آسمان گونجنے لگتا۔ اور جانے کب گونجتے آسمان سے اسلام کھوکھر، اکرام منزل میں گر پڑتا اور بے ہوش ہو جاتا۔ شراب کی اس بوتل میں دھیرے دھیرے حلیمہ بھی گھلتی گئی۔ گھر کا خرچ، بچوں کا پالن —— اور حلیمہ کا جیون، سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ لگنے لگا۔ اسلام کھوکھر اس کے لئے جیتے جی مر گیا —— آخر ایک دن حلیمہ بچاری نے مرے ہوئے آدم کا پیرہن اتار کر دور پھینک دیا اور اپنی بھوک کا بوریا بستر اٹھا کے ہمیشہ کے لئے قاسم کے گھر چلی گئی —— اکرام منزل کی سفید دیوار پر یہ پہلا اشتہار لگا تھا۔

اکرام منزل کا دوسرا چاند، انعام کھوکھر، جلد ہی اس بڑے شہر کا بڑا چاند بن گیا ——

"حرام زادو! میں تمھاری ہڈیاں توڑ دوں گا، میں تمھیں قتل کر دوں گا —— اوئے! تمھاری ماں کی، تمھاری بہن کی ——" ہاں! یہ گالیاں ہی ہیں خدا کی بخشی ہوئی زبان سے نکلنے والی گالیاں۔ ہر رات اکرام منزل کی دیواروں کو چیر کر میرا پیچھا کرتی ہیں۔ میرے کان پھٹنے لگتے ہیں یہ گالیاں سُن کر —— یہ گالیاں ساری ساری رات مجھے سونے نہیں دیتیں۔ مجھے بہت بے چین کر دیتی ہیں۔ کیونکہ اکرام منزل کی دیواریں میرے کچے کوٹھے کے ساتھ لگتی ہیں۔ اور میں اپنی کوٹھڑی کے اندر بیٹھا سب کچھ سنتا رہتا ہوں۔ بہت کچھ دیکھتا رہتا ہوں —— میں نے اکرام منزل کی بہاریں دیکھی ہیں۔ اس میں دولت، عزت، شرافت، لیاقت اور غیرت کا راج دیکھا ہے اور میں پچھلے بیس سال سے اکرام منزل میں شراب، بے حیائی اور گالی گلوچ کا راج دیکھ رہا ہوں ——

انعام کھوکھر —— کچا شرابی، نکما مستری۔ ٹرانسپورٹ ورکشاپ میں تیل گریسیا۔ اوپر سے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ورکشاپ کے کام کا خدا ہی حافظ ہے۔ حاضری کلرک کو ماہوار دس روپے دیجئے، پھر چاہے پورا مہینہ ورکشاپ سے غائب رہیئے۔ ملازموں کی حاضری لگتی رہتی ہے۔ انعام کھوکھر نے بھی حاضری کلرک کے ساتھ مہینہ لگا رکھا تھا وہ کئی کئی دن ورکشاپ سے غائب رہتا۔ کوئی کمائی کرنے کے لئے نہیں، صرف شراب کے ٹھیکے کا طواف کرنے کے لئے، ٹھرّے کی بوتل پینے کے لئے، نالیوں میں گرنے کے لئے اور ہر رات گالی گلوچ بکنے کے لئے۔ اچھی زندگی کے لئے جدوجہد کرنا وہ بیکار سمجھتا تھا۔ پہلے وہ شراب کو پیتا تھا پھر آہستہ آہستہ شراب اُسے پینے لگی ــــ گھر کا خیال، نہ بچوں کی فکر، بیوی کا غم، نہ اپنوں کا لحاظ، نہ بیگانوں کا ڈر۔ محلے داروں، رشتے داروں اور ہمسایوں سے بے پروا۔ انعام کھوکھر اکرام منزل میں چنگھاڑتا رہتا۔ ہر رات بھیانک گالیوں کے روپ میں۔ انسانی ضمیر کو قتل کرنے والی گالیاں ــــ اور اکرام منزل کی دوسری بہو.....زہرہ، انعام کھوکھر کے گھر کی مُرغی، اپنے چوزوں کو فاقوں سے بچانے کے لئے، انھیں دانہ کھلانے کے لئے ــــ کبھی کبھی پرائے گھروں میں بھی جانے لگی، لیکن اُس نے اپنے آدم کا پیرہن گلے سے نہیں اتارا۔ اس نے اس پیرہن کو ہی اپنی تقدیر مان لیا ــــ اپنے آدم کے لباس میں چھپ کر رنگ برنگے کپڑے پہننے والی زہرہ کی باتیں ہونے لگیں۔ باتیں منہ سے نکل نکل کر محلّے میں پھیلنے لگیں۔ باتوں کا ایک اشتہار بن گیا اور اشتہار اکرام منزل کی دیوار پر چسپاں ہو گیا ــــ اکرام منزل کی میلی دیوار پر لگا ہوا یہ دوسرا اشتہار تھا۔ مگر اس اشتہار کی عبارت سے بے خبر انعام کھوکھر اپنے رنگ میں مست تھا ــــ اس اشتہار کی کالی سیاہی سے بے فکر زہرہ، گھر کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگی ہوئی تھی ــــ وقت کا گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا۔ پر انعام کھوکھر کے لئے تو وقت اس دن سے رکا ہوا تھا جس دن سے اس کی زبان نے شراب کا ذائقہ چکھا تھا ــــ پھر شراب کے ذائقے نے باقی سب کچھ ہضم کر لیا، لیکن وقت کسی سے بھی ہضم نہیں ہو سکا۔ وقت سرپٹ دوڑتا رہا اور دوڑتے وقت کے ساتھ ساتھ کم سن چوزے، سیانے ہو گئے۔ بالغ ہونے والے چوزوں میں سے سب سے بڑے کا نام تھا حُسنا کھوکھر، انعام کھوکھر کی پہلوٹی کی لڑکی۔

حُسنہ کھوکھر ــــ شام کا جھومر، صبح کی جھانجھر، دلکش سندری، پیار کا گلقند، کِھلا موتیا،

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہنستا گلاب۔ حُسنہ کھوکھر ـــــ خوبصورت ابابیل، حُسنہ کھوکھر ـــــ بلبل کیطرح بولتی، کوئل کیطرح کوکتی۔ شادی بیاہ کی محفلیں اُسے گلے لگاتیں۔ گانے، گیت، غزلیں سب کو مست بناتیں روپ کے موتی چگنے والے پنچھی اس کی نیلی آنکھوں میں چوگ چُگنے کی سبیل ڈھونڈتے ـــــ حُسنہ کھوکھر، ایک بل کھاتی ناگن، آوارہ سپیرے اُسے اپنی اپنی پٹاری میں بند کرنے کی فکر کرنے لگے ـــــ اکرام منزل کے اِرد گرد آوارہ گرد، آوارہ دھند پھیلنے لگی ـــــ والدین کی بخشی ہوئی باتیں بچوں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔ حُسنہ کھوکھر بھی اپنے ماں باپ کے زنگ آلود شیشے کی پرچھائیں تھی۔ ان کے کارناموں کا کھٹا میٹھا سنگم۔ وہ بھی اپنے لئے تباہی کا سامان پیدا کرنے لگی ـــــ جوبن اس کے بدن پر پھوڑے پھنسیوں کی طرح پھوٹ پڑا تھا ـــــ اور پھر پھوڑے بھو کے عاشقوں کی جھولی میں پھِسنے لگے۔ وہ کھلے عام اپنے بدن پر جونکیں لگوانے لگی۔ جونکیں جو اس کا گندا لہو چوس لیتیں۔ آوارہ سپیرے اس پر منتر پھونکتے رہتے ـــــ حُسنہ کھوکھر، شہرت کی حدیں پھلانگنے لگی۔ اکرام منزل میں کئی گُلناریں سہیلیوں کے روپ میں آنے جانے لگیں ـــــ سروقد مٹیاریں۔ ساڑھیوں کی سرسراہٹ، شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور جھانجھروں کی چھنچھناہٹ۔ روغنی کھڑوں کو ڈستی زلفیں، تھرتھراتی چھاتیاں مٹکتے کولھے، پھڑکتی رگیں، ناچتی آنکھیں، کانوں میں کھسر پھسر، آپسی رازداریاں اور پھر ہنسی کے دل کش پھوارے۔

حُسنہ کھوکھر، روزی کمانے کا ٹھیکرا بن گئی۔ اس کی نظر روز بروز بالغ ہوتی گئی وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں جانے لگی۔ وہ ایک ایک وقت کے کھانے کا بل سو سو روپے دینے لگی۔ اب سگریٹ شراب اور کباب کے بغیر اسے ناشتہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ کی اڑان بہت اونچی تھی۔ وہ دو جسموں کے ملاپ کو لذت حاصل کرنے کا ایک فطری تقاضا سمجھتی تھی۔ اس کے لئے اب سماجی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ اکثر کہتی کہ اگر دو جوان جسم باہمی رضامندی سے اپنے مشترکہ جذبے کی تکمیل کے لئے ملیں تو یہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس پر سماج والے شور مچائیں اور شرع یا قانون کا آسرا ڈھونڈیں ـــــ حُسنہ کھوکھر، اِس شہر کا روشن ستارا۔ اکرام منزل کی کالی دیوار پر لگا تیسرا مگر سب سے بڑا اشتہار تھا جس کی عبارت پڑھنے کے لئے

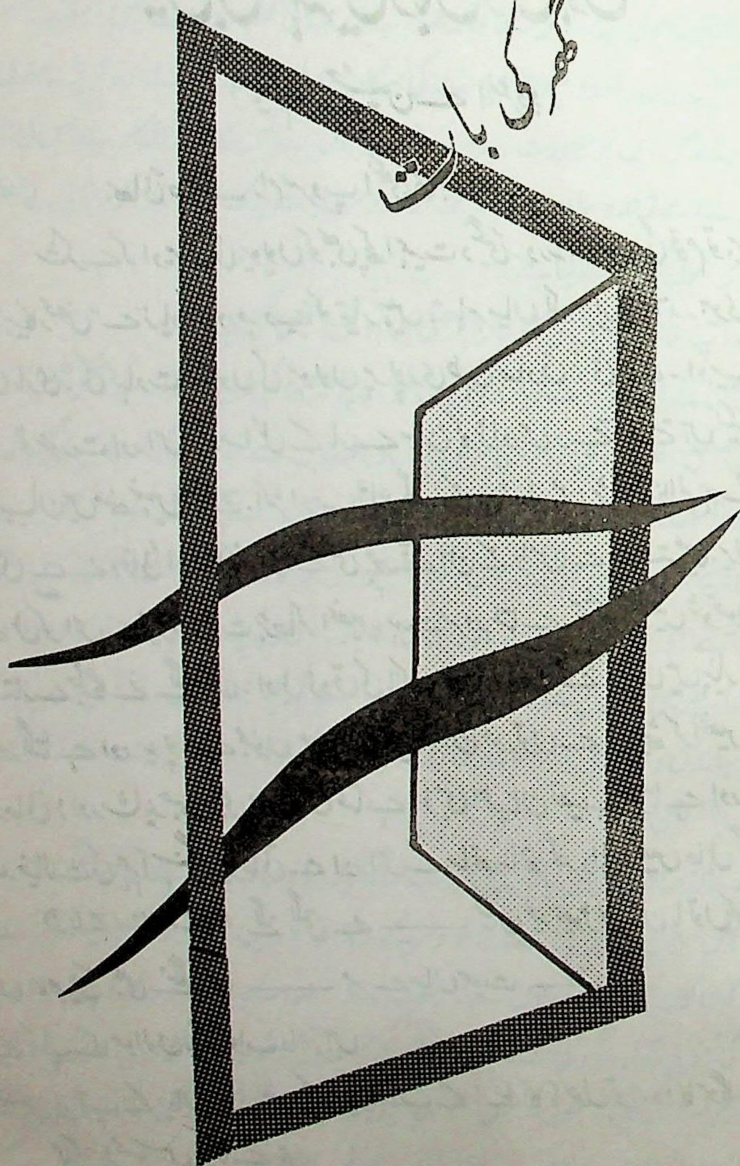
CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

بانکی نظریں بے تاب رہتیں۔

اکرام منزل کے ایک کونے میں ایک گونگا کردار بھی رہتا تھا ــــ جو اپنے خیالوں کے شیشے میں کبھی اکرام منزل کی بہاریں دیکھتا رہتا اور کبھی آنکھوں کے سامنے ناچتے پت جھڑ کو۔ اس گونگے کردار کا نام بے بے حاجراں تھا ــــ مستری اکرام کھوکھر کی بیوہ۔ اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر کی ماں۔ بیتی زندگی کے پُر بہار دنوں کی یاد آتے ہی اس کے چہرے پر چراغ روشن ہو جاتے لیکن حویلی کی بگڑی حالت دیکھ کر گونگا کردار خاموش رہتا۔ اس کی آنکھوں سے گنگا بہتی۔ اکرام کھوکھر کی موت کے بعد بے بے حاجراں کے چہرے پر کئی دراڑیں پڑیں۔ پھر رفتہ رفتہ دراڑیں اس کا نصیب بن گئیں۔ اس کی ساری حسرتیں، امیدیں اور خواہشیں مٹی میں مل گئیں ــــ اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر، بے بے حاجراں کے گلے کے گلھڑ ــــ اسے بہت تکلیف دیتے۔ وہ دکھوں کی بھٹی میں جل جل کر کوئلہ بن چکی تھی۔ جانے اس نے کتنے سال، مہینے اور دن ہضم کر لئے تھے، پر پھر بھی کوئلہ راکھ نہیں بن رہا تھا۔ بے بے حاجراں بہت دعائیں مانگتی مگر آسمان اس پر مہربان نہیں ہو رہا تھا۔ اکرام منزل کی دیواروں پر لگے اشتہاروں کو دیکھ کر بے بے حاجراں بہت دُکھی تھی وہ دن کے اجالے میں لگنے والے اشتہاروں کو رات کے اندھیرے میں پھاڑنے کی کوشش کرتی۔ وہ اکرام منزل کی کالی دیوارں کو دھوتی، اشتہاروں کی عبارت کو مٹاتی، پر کالی دیواروں کو وہ جتنا صاف کرتی اشتہاروں کے لفظ اتنے ہی گہرے ہوتے جاتے۔ وہ بے چین ہو جاتی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ حُسنہ کھوکھر کے جسم کو دس بارہ جونکیں اکٹھی ہی چمٹ گئیں، اس کے جسم کا سارا گندا لہو چوسنے کے لئے۔ مگر ان جونکوں نے اپنی کھوکھری سے حُسنہ کھوکھر کا سارا جسم زخمی کر دیا۔ وہ بچاری لہولہان ہو گئی اور آخر اسکے کچھ خیرخواہوں نے اسے بیہوشی کی حالت میں اکرام منزل میں لا پھینکا حُسنہ کھوکھر کو بیہوش دیکھ کر اکرام منزل میں ایک زلزلہ آیا کالی چتی دیواریں کانپیں، اشتہاری دیواریں لرز اٹھیں۔ اور پھر ساری خستہ حویلی دھڑام سے ڈھے گئی۔ حویلی گرنے کی ایک بھیانک آواز آئی۔ لوگ دوڑے، اکرام منزل کی گرتی دیواریں دیکھنے کے لئے۔ حویلی کو مٹی میں ملتے سب نے دیکھا۔ تماشہ دیکھنے والے لوگ ٹوٹی دیواروں پر لگے کئی اور چھوٹے موٹے اشتہار بھی پڑھنے لگے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ گری ہوئی حویلی کے ملبہ کی گرد سے اکرام منزل کے مکیں اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے باہر آئے۔ اور اپنے سر سجدوں کے میناروں سے بھی اونچے کر کے چلنے لگے صرف اکرام منزل کا گونگا کردار غائب تھا۔ اُسے کسی نے ڈھونڈا بھی نہیں۔ شاید وہ حویلی کے ملبہ کے نیچے دب گیا تھا اور مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا تھا ــــ

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

میں بھی منہہ میں زبان رکھتی ہوں

(بیگم خالد حسین سے انٹرویو)

بھائی صاحب رام سروپ انکھی جی! آداب

شکر ہے کہ ادیبوں کی بیویوں کو بھی کچھ اہمیت دیگئی۔ ورنہ ادیبوں کی قوم تو بیویوں کو "بیکار محض" سے زیادہ کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ "باہر میاں لکھ ہزاری، اندر بیوی قہر دی ماری" کی کہاوت ادیبوں کی بیویوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ ادیب شاعر یوں تو عورت اور اس کے مسائل کے بارے سماج کو بڑا درس دیتے رہتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں منہ نہیں ڈالتے۔ اکثر ادیب شاعر گھر کے معاملے میں بڑے ظالم ہوتے ہیں بیوی سے بے وفائی اور ناانصافی کے کئی چور قصے ان کے دامن سے وابستہ ہیں۔ پرائی عورت سے مل کر اس سے میل ملاقات بڑھا کر انھیں بہت سرور ملتا ہے۔ آنکھوں میں شوخیوں کے ستارے جگمگانے لگتے ہیں۔ ادبی ذوق کی مالک عورتوں کے لئے دلوں میں پیار لہریں لینے لگتا ہے اور یہ پورے مجنوں بن جاتے ہیں۔ ان عورتوں سے مل بیٹھ کر انھیں بیحد روحانی (اور شاید جسمانی بھی) سکون ملتا ہے۔ ذہنی اطمینان نصیب ہوتا ہے اور بہت جلد خیالات کی ہم آہنگی ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھر والی انھیں جاہل گنوار اور UNCIVILIZED لگنے لگتی ہے ——— لیکن خیر چھوڑیں ان باتوں کو ———

اس حمام میں سبھی ننگے ہیں ——— میرے میاں سمیت ———

لیجئے آپ کے سوالوں کے جواب حاضر ہیں۔

س :- آپ کے میاں پنجابی میں لکھتے ہیں، آپ کے مائیکے کا ماحول تو اردو کا ہوگا، ؟ آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے ؟

ج :- میرے ... سسرال کے خاندان کئی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھئے

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ہمارا قبیلہ ایک ہی ہے۔ دونوں گھرانے ضلع ادھم پور کی تحصیل رام نگر کے رہنے والے ہیں۔ ہم ڈوگرے ہیں اور گھر میں پنجابی یا ڈوگری ہی بولتے ہیں۔ ہمارا ماحول پوری طرح پنجابی ماحول ہے۔ اسی لئے خالد صاحب کی پنجابی تحریروں سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اردو ہماری ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اس لئے وہ تو پڑھتے ہی ہیں ویسے بھی اس خوبصورت زبان کے حسن و جمال سے کس کافر کو انکار ہے جس کی شاعری نے اسے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس زبان کو پنجابی نے لفظوں کا انمول خزانہ عطا کیا ہے۔

س:۔ آپ خالد صاحب کی کہانیاں پڑھتی ہی ہونگی۔ کیسی لگتی ہیں؟

ج:۔ میں نے ان کی بہت زیادہ کہانیاں نہیں پڑھیں کم ہی پڑھی ہیں۔ گورمکھی رسم الخط میں پڑھ نہیں سکتی۔ صرف وہی کہانیاں پڑھی ہیں جو پنجابی سے ترجمہ ہو کر اردو میں چھپی ہیں یا پھر براہ راست اردو میں ہی لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ "تے جہلم وگدا رہیا" بھی میں نے پڑھ لی ہے۔ میں گھریلو عورت ہوں، گھر اور بچوں کی دیکھ بھال نگہداشت میں ہی کافی وقت گذر جاتا ہے اور پھر سماجی ذمہ داریاں نبھانے کا بار۔ اسی وجہ پڑھنے پڑھانے کا زیادہ موقع نہیں ملتا۔ پھر بھی میری پسند کے مطابق خالد صاحب کی کہانیوں میں سے "بیڑے کی لنکا" "اشتہاروں والی حویلی"، "مائے نی میں۔ کہہ نوں آکھاں" "گھر کی جنت"، اور "کوار گندل (گرداب)" اچھی ہیں۔

س:۔ خالد صاحب کن کن باتوں میں برے لگتے ہیں یا یوں کہئیے کہ اچھے نہیں لگتے؟

ج:۔ اس سوال کے جواب کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ شکایتوں کا ایک انبار ہے کون کون سی فائل کھولوں —— پھر بھی —— سب سے پہلے تو مجھے اپنے صاحب کی "ادبی آوارہ گردی" سے سخت چڑ ہے۔ یار دوستوں کی محفلیں (ان میں خواتین بھی شامل ہیں) ادبی مجلسیں، کانفرنسیں، صبح صبح گھر سے نکل جانا، رات گئے لوٹنا، بال بچوں کے فکر سے یکدم آزاد، گھریلو جھنجھٹوں سے کنارہ کش، یہ حضرت صحیح معنوں میں آزاد بھارت ورش کے آزاد شہری ہیں اور شراب آزادی کو جرعہ جرعہ نہیں

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

خم بہ خم پی رہے ہیں، میرے میاں بڑے یار باش ہیں (کاش کچھ بیوی پرست بھی ہوتے)
بیوی گھر بیٹھی لاکھ کاگ اڑائے مگر میاں جی اپنی مرضی سے ہی گھر پر پدھاریں گے۔ لیکن
قارئین کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ کچھ دنوں سے آپ کچھ قابو میں آئے ہیں۔ کچھ گھر کا
خیال ہوا ہے۔ شاید بچے جوان ہوجانے کی وجہ سے یا پھر شاید باہر کی رونقیں کچھ
کم ہوگئی ہیں یا پھر سرکاری مصروفیات نے کچھ باندھ رکھا ہے —— دوسری شکایت
یہ کہ میرے میاں نے ہر کہانی آنکھوں دیکھے سچ کی بنیاد پر لکھی ہے۔ اکثر واقعات گردوپیش
سے لیے ہیں۔ بارہا سمجھایا کہ یہ طور طریقے چھوڑ دیں۔ کسی کی بہن بیٹی میں کیڑے نکالنا اچھا
نہیں۔ ہمارے اپنے بھی بچے ہیں کچھ شرم کریں —— لیکن جناب توبہ کیجئے ان پر
کوئی اثر نہیں ہوتا اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کئی بار تو ہمارے ہمسائے، ماں جائے گالیوں
کے تیر کمان سنبھالے لڑنے کے لئے آدھمکتے ہیں۔ خوب یکطرفہ مہابھارت کھیلی جاتی
ہے کیونکہ میاں صاحب گھر پر نہیں ہوتے اور ان باتوں کا جواب دینا اور پرائی آگ
میں ہاتھ جلانا میں بیوقوفی سمجھتی ہوں، کبھی غلطی سے آنجناب گھر تشریف بھی رکھتے ہوں
تو کان پر جوں نہیں رینگتی۔ خدا کرے صحت و تندرستی سے لمبی عمر پائیں میرے میاں،
بڑی بے نظیر شے ہیں۔ ایک بار کسی بڑے افسر کا اصلی چہرہ دکھانے کے لئے اس کا
کوئی سچا جھوٹا افسانہ لکھ مارا۔ بس پھر کیا تھا سرکاری عتاب نازل ہوگیا اور صاحب نوکری
سے معطل —— انکوائری کمیشن بیٹھ گیا اور قریباً سال بھر کے بعد کہیں بحال ہوئے
وہ بھی صرف میری دعاؤں اور بددعاؤں کے طفیل۔ دعائیں اپنے میاں کی بحالی
کے لئے اور بددعائیں اس کمینے افسر کے لئے جس ظالم نے میرے بچوں کے منہ سے لقمہ
چھیننے کی کوشش کی اور زیور بکوانے تک نوبت پہنچائی کہ گھر کا خرچہ چل سکے۔ مگر اتنا
کچھ ہونے پر بھی جناب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے بعد اصلی ناموں کے ساتھ
ایک حقیقی واقعے کو کہانی کا روپ دے ڈالا اور "بیڈے کی لنکا" کا جنم ہوا۔ محلے والوں
نے وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ خالد صاحب کو پشتوں کا جغرافیہ یاد دلادیا۔ آگ لگے
ایسے سچ کو —— اور پھر آج سچ بولتا بھی کون ہے کہ سچ لکھنا برداشت ہوجائے۔

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

لیکن یہ بات انھیں سمجھائے کون۔ اور اس کے علاوہ میں یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں اِن سے کہ کیا وہ مجھ سے ہمیشہ سچ ہی بولتے رہے ہیں۔ جب خود اپنے باطن میں جھوٹ بھرا ہو تو پھر لوگوں کی سچی سچی لکھنے سے فائدہ ؟

س: میاں بیوی کے لئے برے دن بھی تو کبھی آئے ہونگے ؟

ج: جی ہاں! کیوں نہیں، لیکن میاں کے لئے کم، بیوی کے لئے زیادہ۔ پھر بھی ہم نے یہ دن بڑے حوصلے ہمت سے اور ہنس ہنس کر گذارے۔ شکر ہے پروردگار کا کہ آج ہم ہر طرح خوش ہیں۔ اچھی نوکری ہے اپنا گھر بار ہے۔ ہماری شادی کو خیر سے ۲۵ سال ہونے کو آئے لیکن پتہ ہی نہ چلا کہ اتنا طویل عرصہ کیسے گزر گیا۔ میں تو بہت خوش ہوں لیکن سُنا ہے کہ خالد صاحب کچھ دکھی ہیں۔ یاروں دوستوں کی محفلیں نہیں جمتیں، پنجاب کے چکر کم ہوگئے ہیں۔ نوکری میں سیاسی مداخلت، سرکاری مصروفیات، یہ سبھی صدمے برداشت کر رہے ہیں آج کل۔ لکھنے لکھانے کا بھی سلسلہ نہیں رہا۔ پوچھو تو کہتے ہیں موڈ نہیں بنتا۔ اللہ کرے یہ موڈ کبھی نہ بنے تاکہ بیوی بچوں کی جانب بھی دھیان دے سکیں۔ آنے والی سماجی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ادبی اور غیر ادبی آوارہ گردی بہت ہوگئی ـــــ اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی نوٹ کی جائے کہ مجھے ان پر گھر سے باہر آئے بُرے وقت کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ حساب خالد صاحب خود جانیں یا ان کے ادبی اور غیر ادبی یار دوست۔

س: کچھ بچوں کے بارے میں بھی بتائیں ؟

ج: اللہ رکھے ہمارے چار بچے ہیں۔ سمیٰ، ہُما، ذاکر اور یاسر۔ دو بچیاں اور دو لڑکے۔ جیسے خالد صاحب کو اپنی کہانیاں اور ان کے مسودے عزیز ہیں اسی طرح میرے بچے بھی میری آنکھوں کے تارے ہیں۔ لیکن آج کل تو وہ بھی بچوں کو بہت پیار کرنے لگے ہیں۔ خاص طور پر یاسر تو انھیں بہت ہی عزیز ہے۔ اس سے انھیں بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ ان کی امیدیں پوری کرے۔ آمین۔

س: پنجاب کے حالات بارے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ ؟

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

ج : پنجاب کے حالات بارے پڑھ کر ہم بہت دکھی ہیں۔ ہم نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کا خمیازہ بھگتا ہے ہمارے اپنے گھر اجڑے تھے۔ میرے میاں کے داداجی، والدصاحب چچا سبھی فرقہ پرستی کی قتل گاہ میں قربان کردئیے گئے تھے۔ آج پھر وہی ماحول بن رہا ہے۔ معصوم لوگ مارے جارہے ہیں۔ فرقہ پرستی اور تعصب اس ملک کے لئے زہر ہے۔ یہ پنجاب میں ہو یا میرٹھ میں، الہ آباد، گجرات میں ہو یا دلی کشمیر میں، نقصان تو انسان اور انسانیت کا ہوتا ہے ـــــ آج سارے ملک میں افراتفری ہے۔ ہمیں مسلمان ہندو سکھ یا عیسائی بن کر نہیں بلکہ انسان بن کر سوچنا چاہیئے۔ اخبار نویسوں یا سیاسی لیڈروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ خون کا رنگ ہر جگہ یکساں ہے ـــــ سرخ اور صرف سرخ ـــــ یہ رنگ مسلمان کے خون کا بھی ہے ہندو اور سکھ کے خون کا بھی۔ اس لئے کسی بھی خاص مذہب یا فرقے کے لوگوں کا خون کہیں بھی بہے تلخیاں بڑھیں گی۔ ہمیں سب حالات انسانیت کی عینک سے، بھائی چارے کے نظریے سے دیکھنے چاہئیں۔ یہ ملک ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، خدا پرست، ناستک سبھی کا ہے کسی خاص فرقے یا قوم کی جاگیر نہیں۔ اقلیتیں بھی اس ملک کی اتنی ہی وفادار ہیں جتنا اکثریتی فرقہ۔ شک و شبے کے حالات زہر قاتل ہیں۔ کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جانی چاہیئے جس سے نفرت پھیلے تشدد سے کوئی مسئلہ حل ہوا ہے نہ ہوگا۔ ایک دوسرے پر اعتماد کی فضا بحال ہونی چاہیئے۔ شک و شبہ جے چند اور میر جعفر پیدا کرتا ہے اور ہمیں ملک و قوم کی ترقی و تعمیر کے لئے جے چند اور میر جعفر کی نہیں، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا گھر، اپنی ریاست اور اپنا ملک اجڑنے سے بچانا ہے۔ پنجاب بارے میری دعا ہے کہ:

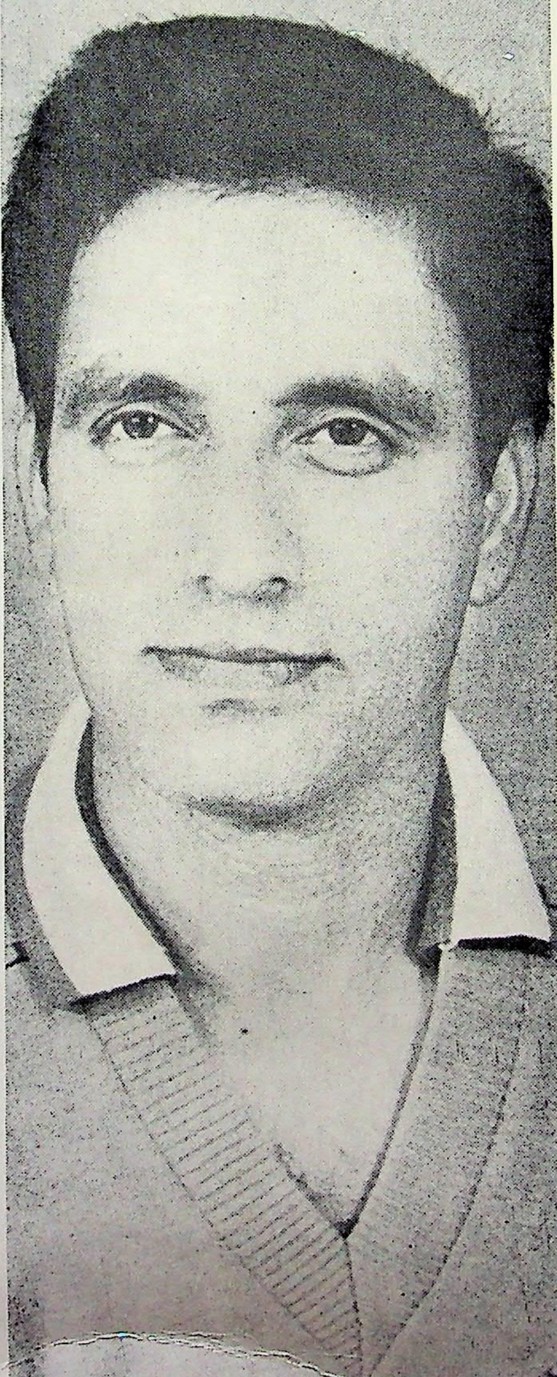
"سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد"

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri



ان افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ افسانے کی روایتی موضوعی پیش کش اور میکانکی ہیئتی برتاؤ سے انحراف کی ایک اچھی مثال فراہم کرتے ہیں۔ یعنی افسانہ نگار من مانے طریقے سے کسی مفروضہ کو کہانی کا موضوع نہیں بناتا، نہ ہی وہ فنِ افسانہ کے مسلمہ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کو اپنے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب ضرور کرتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کھردرے پن کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے عمل میں وہ موضوعی پیش کش سے زیادہ شخصی تاثرپذیری کی دریافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس طرح سے افسانہ اپنی تخلیقی حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ فن کے مروجہ لوازم کو سختی سے نہ پورا کرتے ہوئے بھی اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ فنکار کے داخلی وجود سے برآمد ہوتا ہے، اور اس کے نکرِ نظر کی سچائی کا احساس دلاتا ہے

(اقتباس پیش لفظ ـــــ ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں)

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

حضرت بل، سرینگر

CC-0. Sohail Kazmi Collection, Jammu. Digitized by eGangotri